الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ جو جی میں آئے کرے اور جو لفظ چاہے منھ سے نکالے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جائز حدود میں زندگی گزارے اور ناجائز چیزوں سے ہمیشہ کے لئے "روزہ" رکھ لے —— رمضان کے مہینے کا روزہ اسی قسم کی روزہ دار زندگی کا ایک سبق ہے جو ہر سال مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔

شمارہ ۲۱
اگست ۱۹۷۸

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۲۱ اگست ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ • قاسم جان اسٹریٹ • دہلی ۶

عن ابی قلابۃ عن ابن مسعود قال : ستجدون اقواماً یدعونکم الی کتاب اللہ وقد نبذوہ وراء ظہورہم

جامع بیان العلم ، جزء ثانی ، صفحہ ۱۹۳

عنقریب تم ایسے لوگ دیکھو گے جو تم کو کتاب اللہ کی طرف بلائیں گے۔ حالاں کہ انھوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا ہوگا ۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہ کرم اپنا زر تعاون بذریعہ منی آرڈر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں ـــــ مینجر الرسالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر نظر شمارہ میں صفحہ ۱۶ کے بعد آخر تک جو مضمون شامل کیا گیا ہے، وہ ایک بے حد اہم مضمون ہے۔ اس بنا پر اس کو علیحدہ ٹائٹل لگا کر مستقل پمفلٹ کی صورت میں چھپوا لیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے " دین کیا ہے "۔ اس پمفلٹ کی عام قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے رکھی گئی ہے۔ تاہم عمومی اشاعت کے لئے جو لوگ اس کو زیادہ تعداد میں منگائیں، ان کو ادارہ کی طرف سے خصوصی کمیشن دیا جائے گا۔ ضرورت ہے کہ اس پمفلٹ کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے

ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگ ادارۂ الرسالہ کی طرف سے تحریری اجازت نامہ دکھا کر الرسالہ کے نام پر رقمیں وصول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم نے کسی کو ایسا اجازت نامہ نہیں دیا ہے۔ ایسی کوئی بھی تحریر محض فرضی ہے۔ قارئین کرام نوٹ فرمائیں۔

ہم کو الرسالہ ماہ جولائی ۱۹۷۷ کے شماروں کی شدید ضرورت ہے۔ جن لوگوں کے پاس یہ شمارے ہوں اور وہ الگ کرنا چاہیں۔ براہ کرم اپنے شرائط سے ہم کو مطلع فرمائیں ۔

الرسالہ کے دفتر سے نمونہ کا پرچہ مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ آپ، اپنے کسی عزیز یا دوست کو اگر الرسالہ دکھانا چاہتے ہوں تو ان کا پتہ لکھ کر بھیج دیں۔ یہاں سے ان کو نمونہ کا پرچہ بھیج دیا جائے گا۔

آدمی اگر موت کے دوسری طرف دیکھ لے

ایک شخص نے دنیا بھر میں خودکشی کے واقعات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے ان لوگوں کے حالات کا بھی جائزہ لیا ہے جنھوں نے خودکشی کا اقدام کیا۔ مگر کسی وجہ سے مرنے سے محفوظ رہ گئے۔ مصنف نے پایا ہے کہ اس قسم کے لوگ عام طور پر اپنی بعد کی زندگی میں نہایت کامیاب رہے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر جب انھوں نے موت کے بھیانک روپ کو دیکھا تو زندگی ان کو بے حد قیمتی معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے نئی لگن اور نئے اعتماد کے ساتھ زندگی کو قبول کر لیا۔ ان کی ناامیدی دوبارہ امید میں تبدیل ہو گئی۔

"اس سے اچھے تو ہم پہلے ہی تھے"، یہ احساس ان کے اندر زندگی اور عمل کی نئی امنگ پیدا کر دیتا ہے۔ "موت تو کامل بربادی ہے۔ جب کہ موت سے پہلے ہم اس پوزیشن میں تھے کہ بربادی سے نکلنے کی جدوجہد کر سکیں"

یہ صرف اس ابتدائی تجربہ کا نتیجہ ہے جو جسم سے جان کی علیحدگی کے وقت آدمی پر گزرتا ہے۔ اگر آدمی اس سے آگے بڑھ کر یہ دیکھ لے کہ علیحدگی کی تکمیل (موت) کے بعد آدمی جس دوسرے عالم میں داخل ہوتا ہے، وہاں اس پر کیا کچھ گزرے گا تو اس کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ بڑا انقلاب آجائے۔ وہ اپنی زندگی کو تمام تر آخرت کی طرف موڑ دے۔ وہ ہر دوسرے پہلو کو چھوڑ کر آخرت کے پہلو کو ترجیح دینے لگے۔ آخرت کا معاملہ اتنا سخت ہے کہ آدمی جب اس سے دوچار ہوگا تو ہر وہ چیز اس کو ہلکی معلوم ہوگی جس کی خاطر آج وہ اپنی آخرت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

روزہ

اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، روزہ یہ ہے کہ آدمی علائق دنیا سے اپنے آپ کو کاٹ لے۔ اس قسم کی روزہ داری سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسانی وجود کا مادی پہلو کمزور ہو اور اس کی روحانیت بڑھے تاکہ عالم قدس سے اس کا اتصال ممکن ہو سکے۔ جسم کی مادی غذا کے مقابلہ میں روزہ کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچانا ہے۔

انسان بیک وقت دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک مادہ، دوسرے روح، جس کو موجودہ زمانے کے علمائے نفسیات ذہن سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی وجود کا مادی حصہ اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ موجودہ دنیا میں اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ انتہائی ضروری ہے کہ اس کی روح یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں ذہن، اپنی مجرد حیثیت کو زیادہ سے زیادہ باقی رکھ سکے اور اپنی غیر مادی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرے تاکہ غیر مادی حقائق تک اس کی بے آمیز رسائی ممکن ہو۔

الرسالہ کے پیغام کو پھیلانے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں

اعظم گڑھ (یوپی) میں ایک ڈگری کالج ہے جس کا نام شبلی نیشنل کالج ہے۔ ملک زادہ منظور احمد یہاں انگریزی زبان کے شعبہ میں لکچرر تھے۔ وہ ۱۹۵۲ سے ۱۹۶۴ تک یہاں استاد رہے۔ وہ کمیونسٹ تھے دن کو وہ کالج میں انگریزی کی کلاس لیتے اور شام کے وقت شہر کے چوراہہ پر کھڑے ہو کر پارٹی کا اخبار بیچتے۔ سڑک پر ہاتھ میں اخباروں کا بنڈل لئے ہوئے جب وہ کہتے کہ "وہ پارٹی کیوں نہ کامیاب ہوگی جس میں میرے جیسا آدمی اخبار بیچے" تو سننے والوں پر عجیب تاثر ہوتا۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ چند ماہ پہلے ایک مسلم نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے ایک اسلامی اخبار نکالنا شروع کیا تھا۔ اخبار کی پہلی اشاعت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "میری جوتوں کی دکان ہے اور اللہ کے فضل سے کامیاب بھی۔ مگر مجھ کو پسند نہیں آیا کہ میں زندگی بھر چپل سیوک بنا رہوں۔ آدمی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی میں معزز مقام حاصل کرے۔"

موجودہ زمانہ میں مسلم قوم کے المیہ کی، کم از کم ایک بڑی وجہ وہی ہے جو مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارا ہر آدمی "لیڈر" کی سطح پر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ "ہاکر" کی سطح پر قوم کی خدمت کرنے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ مذکورہ مسلم نوجوان نے سادگی میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔ مگر یہی سارے لوگوں کا حال ہے۔ وہ لیڈر اور ایڈیٹر، مقرر اور مصنف بن کر قوم کی خدمت کرنے کے لئے تو بہت بے قرار رہتے ہیں۔ مگر نچلی سطح پر خدمتِ قوم کا ان کے اندر کوئی جذبہ نہیں۔ اگرچہ ان میں ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو مذکورہ نوجوان کی طرح صاف لفظوں میں اس کا اقرار بھی کرلیں۔

الرسالہ جس تعمیری اور اصلاحی مقصد کے تحت نکالا گیا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اشاعت

سفر ابتدا سے شروع ہوتا ہے نہ کہ درمیان سے

"We must start again from scratch . . ."

ہم کو ابتدائی نقطہ سے اپنا سفر شروع کرنا ہے

کوئی شخص اگلی منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کرسکتا۔

سفر کا آغاز جب بھی ہوگا وہیں سے ہوگا جہاں آدمی فی الواقع کھڑا ہوا ہے —— ایک شخص دہلی میں ہے اور بمبئی پہنچنا چاہتا ہے، ایسے شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دادر سے اپنا سفر شروع کرے۔ اس کو بہر حال دہلی سے چلنا ہوگا۔ دادر سے سفر شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سفر کبھی شروع ہی نہ ہو۔

زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے مسلم بھائیوں... سے مذکورہ کمیونسٹ جیسے تعاون کی امید تو نہیں کرسکتے۔ تاہم اس سے کم تر درجہ کے ایک تعاون کی ہم ان سے اپیل کررہے ہیں۔ وہ یہ کہ ہر شخص جو ہم سے ہمدردی یا اتفاق رکھتا ہے، وہ اپنے مقام پر رسالہ کی ایجنسی قائم کرے۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا چندہ دینا لوگوں کو مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے ہو تو ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اسے لے لیتے ہیں۔ اس صورت حال میں الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر ہر جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ یہ کم سے کم تعاون ہے جو الرسالہ کے ہمدرد الرسالہ کے خیالات کو عام کرنے کے لئے ہمیں دے سکتے ہیں۔

ایجنسی لینے والے کے لئے اس کام میں کسی نقصان کا سوال نہیں ہے۔ کیوں کہ شرائط ایجنسی کے مطابق غیر فروخت شدہ پرچے واپس لے لئے جاتے ہیں۔ بہترین عملی صورت یہ ہے کہ کم تعداد سے ایجنسی شروع کی جائے ابتداءً پانچ یا دس پرچے منگائے جائیں اور پھر حالات کے مطابق بڑھایا جاتا رہے۔ تعاون کی یہ صورت ہلکی بھی ہے اور بے خطر بھی۔ اگر ہمارے ہمدرد اس پر عمل کریں تو چند سال میں اس کے عظیم نتائج نکل سکتے ہیں۔

(وحیدالدین)

زندگی بہت دور خلا میں پیدا ہوئی اور پھر وہاں سے زمین پر آئی

پچھلے سو برس سے ڈارونی ارتقائی نظریہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں پر حکومت کرتا رہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق زمین پر طبیعی حالات کے عمل اور ردعمل سے زندگی پیدا ہوئی اور زمینی حالات میں ارتقا کے مراحل طے کرتی رہی۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں، اس نے اس نظریہ کی اعتباریت ختم کردی ہے۔

اس کی ایک تازہ مثال وہ تحقیق ہے جو پروفیسر چندر وکرماسنگھی (سری لنکا) اور سر فریڈ ہویل (برطانیہ) نے مشترکہ طور پر پیش کی ہے۔ ان دونوں کا کہنا ہے کہ ان کی دریافت حیاتیات اور فلکیات کے بارہ میں بہت سے مزعومات کو بدل دے گی۔ دونوں سائنس داں کارڈف یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ انھوں نے برطانیہ کی سائنس ریسرچ کونسل میں درخواست دی تھی کہ ان کو ۷۵۰۰ پونڈ کا عطیہ دیا جائے، تاکہ وہ اس میدان میں اپنی تحقیق کو جاری رکھ سکیں۔ کونسل نے اس درخواست کو رد کردیا۔ کیوں کہ "ان کا نظریہ ڈارونی اصول کو چیلنج کررہا ہے۔"

دونوں سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ زندگی بہت دور خلا میں کسی دمدار ستارہ پر پیدا ہوئی اور اس کے بعد کسی وقت زمین پر آئی۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کے حق میں مقالات شائع کئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں شمسی نظام میں جو دمدار ستارے تھے، انھوں نے عظیم تہذیبی مرکز کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں پیچیدہ قسم کے مالیکیول باہم ملے۔ ان کو گرمی ملتی رہی۔ اس طرح ابتدائی زندگی وجود آئی۔ پھر کسی وقت دمدار ستارے کا زمین سے ٹکراؤ ہوا اور اس کے بعد زندگی زمین پر پہنچی ——— سائنس مذہب کے تخلیقی نظریہ سے کتنی قریب آتی جارہی ہے

ظہور اسلام

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت

بارہ روپے

ایک تعلیم یافتہ شخص نے "ظہور اسلام" کو پڑھنے کے بعد کہا:
"مجھے معلوم نہ تھا کہ اسلام کے اوپر ایسی کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے۔
میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسی عجیب و غریب کتاب میں نے
آج تک نہیں پڑھی تھی۔"

اسلام کو عصری اسلوب میں سمجھنے کے لئے "ظہور اسلام" اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے

مکتبہ الرسالہ
جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

اسلام فرانس کا دوسرا مذہب بن چکا ہے

Times (London) March 5, 1978

In 20 years Muslims have become far more numerous than Protestants

Islam is France's second religion

From Charles Hargrove
Paris, May 2

It is surprising that in the past 20 years Islam has become the second most important religion in France after Roman Catholicism. It is far ahead of Protestantism and mosques served by permanent imams now stand in 17 provincial centres.

Roman Catholic churches are often three-quarters empty. But Friday prayers in the Paris Mosque attract between 5,000 and 6,000 people who spill out into adjoining halls and courtyards to listen to the prayers over loudspeakers.

For the feast of Ad-id-al-Sarhir, which marks the end of Ramadan, the congregation swells to nearly 11,000, and all round the mosque people kneel in the streets.

It is estimated that there are 14 million practising Catholics in France as distinct from people baptized as Catholics, who are far more numerous. The Muslims come next with about two million, then protestants with 1,250,000; Jews, who number 900,000, and Buddhists, about 80,000.

Before 1939 the Muslim population of France was so small that there were no official statistics of their number.

But after the Second World War the Muslim population changed. Many families settled here, particularly from the former colonies in North Africa. Sometimes they had to live in appalling conditions.

The wave of immigration increased sharply after 1954 and lasted until 1970. In addition to the families from North Africa, large numbers arrived in France from black Africa.

Now the Muslim community consists of mainly working people, and about 250,000 of them live in the Paris region. In Marseilles there are about 750,000, and in Lyons about 300,000. Some are professors, others cannot read or write. The only think they have in common is their faith in Islam.

Speaking about this disparate community, Si Hamza Boubakeur, rector of the Muslim Institute of the Paris Mosque, said: "I realized that I could not afford to stress religious differences, but must give common spiritual nourishment to all, free from any sectarian spirit".

He was also confronted with many material problems: housing, jobs, education, and integration into the French community. The women, on whom the family structure is based, at first found themselves in a "linguistic prison", unable to communicate.

On a wall of his study is a portrait of the Shah of Iran. "The Shah's Government was the only one that helped me materially", he said. "He gave me carpets for the mosque and money".

About three-fifths of France's Muslims practice their religion. "The social pressure to worship is not as strong as in a Muslim country and the conditions are not favourable", Si Hazan Boubakeur said. "But many Muslim workers observe Ramadan even on the assembly line".

یہ اچنبھے کی بات ہے کہ پچھلے ۲۰ برسوں میں اسلام فرانس کا دوسرا سب سے زیادہ اہم مذہب بن گیا ہے۔ وہ صرف رومن مسیحیت کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ پروٹسٹنٹ مسیحیت سے وہ بہت آگے ہے۔ فرانس کے ۱۷ صوبائی مرکزوں میں مستقل اماموں کے ساتھ مساجد قائم ہیں۔

رومن کیتھولک چرچ اکثر تین چوتھائی خالی رہتے ہیں مگر پیرس کی مسجد میں جمعہ کی نمازوں میں پانچ ہزار سے چھ ہزار تک آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ آنگن اور ملحقہ کمروں تک بھرے ہوتے ہیں تاکہ نماز اور خطبہ کو لاؤڈ اسپیکر پر سن سکیں۔

عیدالفطر کا تیوہار جو رمضان کے ختم پر ہوتا ہے، اس میں نمازیوں کا اجتماع گیارہ ہزار تک پہنچ جاتا ہے۔ مسجد کے چاروں طرف سڑکوں پر لوگ جھکے ہوئے عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اندازہ ہے کہ فرانس میں ۱۴ ملین عامل کیتھولک ہیں، بمقابلہ بپتسمہ لینے والے کیتھولک کے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمان دوسرے نمبر پر ہیں جن کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ اس کے بعد پروٹسٹنٹ ہیں جن کی تعداد ۱۲۵۰۰۰۰ ہے۔ یہودیوں کی تعداد نو لاکھ ہے اور بدھسٹ کی تعداد ۸۰ ہزار ہے۔

۱۹۳۹ء سے پہلے مسلم آبادی فرانس میں اتنی کم تھی کہ ان کے بارے میں کوئی سرکاری اعداد و شمار موجود نہ تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلم آبادی بڑھنا شروع ہوئی۔ بہت سے مسلم خاندان فرانس میں آباد ہو گئے، خاص طور پر شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کے بعض اوقات ان کو خوف و ہراس کی حالت میں رہنا پڑتا تھا۔

جس نے اسلامی ملکوں کو اپنی نوآبادی بنانا چاہا تھا، وہ اب خود اسلام کی نوآبادی ہو رہا ہے۔

۱۹۵۴ کے بعد مہاجرین کا سیلاب بہت تیزی سے بڑھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔ شمالی افریقہ سے آنے والے مسلم خاندانوں کے علاوہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد سیاہ افریقہ سے بھی فرانس میں داخل ہوئی۔ اب فرانس کے مسلمان زیادہ تر مزدور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۲۵۰۰۰۰ پیرس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ مارسیلز میں ۷۵۰۰۰ مسلمان ہیں اور لیونس میں ۳۰۰۰۰۔ ان میں سے کچھ پروفیسر ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ واحد چیز جو ان میں مشترک ہے وہ اسلام کا عقیدہ ہے۔

حمزہ ابوبکر پیرس کی مسجد کے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر ہیں۔ مسلمانوں کے اس مختلف النوع طبقہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "میں نے محسوس کیا کہ میں ان لوگوں کے مذہبی اختلافات کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کے بجائے مجھے چاہئے کہ سب کو مشترک روحانی خوراک دینے کی کوشش کروں جو کسی ایک کے فرقہ وارانہ مزاج سے آزاد ہو۔

ان کے سامنے بہت سے مادی مسائل بھی ہیں — رہائش، روزگار، تعلیم اور فرانس کے معاشرہ سے موافقت۔ عورتیں جن کے اوپر خاندانی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے، وہ ابتداءً اپنے کو ایک قسم کی لسانی قید میں پاتی ہیں۔ وہ خارجی دنیا سے ربط قائم نہیں کر پاتیں۔

حسن ابوبکر کے کمرہ کی دیوار پر شاہ ایران کی ایک تصویر ہے۔ "شاہ کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے مادی طور پر میری مدد کی"۔ انھوں نے کہا "انھوں نے مجھ کو مسجد کے لئے قالین اور پیسہ دیا"۔

فرانس کے مسلمانوں کی بہت تعداد مذہبی فرائض ادا کرتی ہے۔ "عبادت کے لئے سماجی دباؤ یہاں اتنا زیادہ نہیں جتنا ایک مسلم ملک میں ہوتا ہے اور حالات زیادہ موافق نہیں ہیں"۔ حسن ابوبکر نے کہا "مگر بہت سے مسلم مزدور رمضان کے روزے رکھتے ہیں حتیٰ کہ پورے مہینے تک کے"۔

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

"سر! ایک بات کہوں برا نہ مانئے گا"، کالج کے طالب علم نے کہا "میں آج کل قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ جہاں سے بھی کھول کر پڑھتا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی سورہ پڑھ رہا ہوں۔ قرآن میں ہر جگہ آخرت اور جنت اور جہنم ہی کی باتیں ہیں"۔

ایک سادہ ذہن کے طالب علم کو جو بات قرآن میں اتنی زیادہ نظر آئی وہ بڑے بڑے اہل علم کو اس میں دکھائی نہیں دیتی۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ سیاست الہیہ کا جھنڈا اٹھاؤ اور تمام قوموں سے لڑ کر اسلام کی حکومت قائم کرو۔ حالاں کہ سارے قرآن میں کہیں بھی اس قسم کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ جو بات قرآن میں لکھی ہوئی نہیں ہے، وہی لوگوں کے لئے سب سے اہم بات بن گئی ہے:

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

زندگی کا راز
ایڈجسٹمنٹ میں ہے
نہ کہ
مقابلہ آرائی میں

کہا جاتا ہے کہ جاپانی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو "کام" کے مفہوم کو بتاتے ہیں۔ مگر ابھی حال تک جاپانی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ تھا جو "فرصت" کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ غالباً یہ واحد عامل ہے جس نے جاپانی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ محنتی قوم بنا دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی اقتصادیات بالکل برباد ہو گئی تھیں۔ مگر جاپانی محنت نے معجزہ دکھایا۔ جنگ کے صرف ۲۵ سال بعد جاپان نے اقتصادی حیثیت سے دنیا کے چند انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں جگہ حاصل کر لی۔

مسلمانوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے دل چسپ مثال پیش کرتا ہے۔ ہماری زبان میں اختلاف اور ٹکراؤ کے مفہوم کو بتانے کے لئے درجنوں الفاظ ہیں — مگر ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

پچھلے دو سو برس سے ہندستانی مسلمانوں پر احتجاج اور ٹکراؤ کی سیاست اتنی زیادہ چھائی رہی ہے کہ اردو زبان میں اُس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہ بن سکا جس کو انگریزی میں ADJUSTMENT کہا جاتا ہے۔ "با زمانہ ستیز" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں درجنوں الفاظ ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی ایک لفظ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان آج سب سے زیادہ لڑنے جھگڑنے والی قوم بن گئے ہیں۔ حالات سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالنا جیسے ان کو آتا ہی نہیں۔ ان کی جنگ جویانہ تحریکوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھیں خبر ہی نہیں کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ مقابلہ آرائی میں۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں ایک عجیب مشکل یہ پیدا ہوئی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اگر یہ کہتا ہے کہ ملی مقاصد کے حصول کے لئے جو منصوبہ بناؤ، حالات سے ہم آہنگ ہو کر بناؤ تو یہ بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ اس قسم کی آواز حقیقۃً ایڈجسٹمنٹ کی آواز ہوتی ہے مگر سننے والے اس کو "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ کیوں کہ جن الفاظ سے وہ مانوس ہیں انھوں نے ان کو دو ہی مفہوم سے آشنا کیا ہے: زمانہ سے لڑنا یا ہوا کے رخ پر چلنا۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے رویہ کو وہ جانتے ہی نہیں۔

Japanese did not have 'leisure'

There are plenty of words in the Japanese language meaning "work" but till recently it had no word for "leisure". This may be the one single factor to explain how Japan has emerged as a major economic power within the past two decades, says a report in The Times, London.

The Times of India, 9.11.1975

• "الرسالہ" کو میں شوق سے پڑھتا ہوں مگر ہر پرچہ میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو طرز تعبیر کی وجہ سے میرے ذوق پر کچھ بار ہوتی ہے اور اس میں کئی کئی جگہ کھٹک پیدا ہوتی ہے، مثلاً مئی کے پرچہ میں سرورق آپ کا ملفوظ "ہمارے تمام قائدین"، کا انداز قائدین کو اپنی کوتاہی پر متوجہ نہیں کر سکتا البتہ آپ کی دوسری باتوں کی طرح اسے بھی ناقابل توجہ ضرور بنا دے گا، نعرے، پوسٹر، جلسے، کانفرنس، خطابت ان میں کتنی چیزیں جس کو آپ نے شجر ممنوعہ بنا رکھا ہے اور صحافت کو بھی شامل کر لیجئے۔ تو پھر یہ کہوں گا کہ آپ صحافت کے ذریعہ نعرہ لگائیں، پوسٹر نکالیں جلسے اور کانفرنسوں کی روداد لکھیں تو صحیح اور دوسرے لوگ بھی یہی کریں تو "کاٹھ کی ہنڈیا" ہو جائے "تازہ پرچہ کی یہ عبارت "دعوت دین" جو دراصل بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا اظہار ہے وہ تحریر و تقریر .... وغیرہ۔ کیا خیر خواہی کے اظہار کے لئے تقریر و تحریر بھی نہ ہونی چاہئے آخر آپ کون سی آسمانی آواز کو استعمال کر رہے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے من قال هلك الناس هلك الناس فهو اهلكهم اور دوسری حدیث میں ہے کہ آدمی دوسروں میں عیب نکالتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک عیب میں مبتلا کر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، جب آپ اس طرح کی بات لکھتے ہیں تو مجھے اس خیر خواہی کی بنا پر جو آپ کے ساتھ ہے ڈر لگنے لگتا ہے کہ آپ خود ان باتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو خود اپنے گھریلو ماحول سے بھی کچھ سبق ضرور حاصل کرنا چاہئے۔ کیا "انبیا کی آواز"، کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، معاف کیجئے گا آپ حسن البنا وغیرہ کے بارے میں یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ لوگ شہادت کا ٹائٹل لے کر شاندار قبروں میں لیٹ گئے وہ بے چارے تو اب تک گور غریباں میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ تو زبانی (S) لکھ دیتے ہیں انھوں نے غلطاً (S) کے بعد A بھی لکھ دیا ہے۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

بہرحال میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ انداز چھوڑ دیں اگر کسی آدمی پر آپ کو تنقید کرنی ہے تو بالکل نام لے کر دلیل سے لکھئے مگر عمومی نشتر زنی اچھی چیز نہیں ہے۔

ابھی ابھی جون کا پرچہ ملا ہے اس میں بہت سی عمدہ باتوں کے ساتھ بعض باتیں انتہائی قابل اعتراض ہیں۔ آپ امت میں اتفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر بات اختلاف کی کرتے ہیں۔ آپ ان فقہی مسلکی اور ذوقی اختلافات کو دور نہیں کر سکتے البتہ اس میں نقطہ اعتدال پیدا کر سکتے ہیں اور پیار و محبت کے انداز سے یہی کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ اس تیز اور غیر ادب شناس انداز سے آپ کے نفس کو اور کچھ آپ کے نادان مداحوں کو تسکین ہو سکتی ہو اور وہ اسے انبیاء کی آواز بتائیں مگر امت میں جو فکر آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ اس سے نہیں پیدا ہو گا۔

جہاد اصغر اور جہاد اکبر میں جو توازن صحابہ کرام کی زندگی میں بھی تھا وہ بعد میں نہیں رہ گیا۔ کچھ لوگ جہاد اصغر یعنی امت کے وقتی اور ہنگامی کاموں میں پڑے رہے اور کچھ لوگ جہاد اکبر کی انتہا پر رہے اور آج تک ہیں۔

آپ کی تحریروں میں اعتدال ہونا چاہئے۔ آپ وعظ تو اعتدال کا کرتے ہیں مگر آپ جہاد اصغر کو بالکل شجر ممنوعہ قرار دینے کے درپے ہیں حتی کہ اب "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا وعظ کہتے ہیں اور غلام احمد قادیانی کی تحریک کو سراہتے ہیں اور ایک زمانہ میں آپ لکھ چکے ہیں کہ ہندستان کو سمجھنے کے لئے سنگھ اور ساندرا کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک طرف آپ دین میں سادگی کی بات کرتے ہیں اور فقہ اور فنی علوم پر تنقید کرتے ہیں مگر دوسری طرف موجودہ دور کے علوم کے حصول کو سب سے بڑا کام دین کا سمجھتے ہیں اور اسی پر اپنے پورے ماحول کے ساتھ کاربند ہیں۔ آپ دوسروں کو جو چاہیں لکھ دیں مگر خود اپنے بارے میں کوئی بات انتہائی گراں گزرتی ہے جس کا اظہار (ناقدین کے بارے میں) آپ نے پچھلے خط میں قسی القلب کے لفظ سے کیا ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں محقق صوفیا نے جو "کورس" مقرر کیا وہ عوام کے لئے ہے خواص کے لئے نہیں ذکر میں شخصیت کے گھٹنے کی کیفیت اخص الخواص میں پیدا ہو سکتی ہے عوام کی ذہنی سطح کو اس پر لانا نہ تو آپ کے بس کی بات ہے نہ اور کسی کے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔

اس سے پہلے کے بزرگ اگر لفظی ورزش میں مبتلا تھے تو آپ قلمی ورزش میں مبتلا ہیں میں کہاں تک لکھوں اگر میرا بس چلتا تو آپ کی تحریروں کے ایک ایک ٹکڑے کے بارے میں لکھتا کہ آپ کو اپنی صحیح بات " کہنے کے لئے انداز یہ اختیار کرنا چاہئے۔

شاید میرے خط سے آپ کو ناگواری ہو مگر میں آپ کا بدخواہ نہیں ہوں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی تحریریں مقبول ہوں اور خدا نے آپ کو جو صلاحیت دی ہے وہ بادر ہوا ہو کر نہ رہ جائے جیسا کہ ابو الکلام اور عنایت اللہ مشرقی وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ ہو چکا ہے، میرا مقصد یہ ہے کہ امت کے سارے کاموں پر خط نسخ پھیرنے کے بجائے اس کے مفید پہلو سے کام لیا جائے۔

جب سے "الرسالہ" نکلا ہے اس میں آخرت طلبی کے بار بار اظہار کے باوجود مجھے انتہائی خودنمائی کا مظاہرہ نظر آتا ہے آخرت طلب انسان کی تواضع اور فنائیت نظر نہیں آتی۔

آپ یہ بات نوٹ کرلیں کہ دین سے محبت اور چیز ہے اور دین میں غلو اور چیز ہے۔ اس زمانہ میں سب سے بڑا غلو دو ہے ایک یہ کہ امت کے عام (عوام نہیں) آدمیوں کو انبیاء کے معیار پر رکھ کر ان کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جائے دوسرے ان کی خوبیوں سے کام لینے کے بجائے ان کو بالکل نکما ثابت کیا جائے۔

زبانی یا کاغذ کے اوپر فاران کی چوٹی جیسا وعظ کہنا آسان ہے مگر عملی طور پر آپ کوئی چھوٹا سا کام بھی کریں تو آپ کو معیاری اور روایتی فرق معلوم ہو جائے گا اور شاید لیڈری اور بزرگی کی دوکان لگانے والوں کی کچھ اہمیت آپ کے ذہن میں بیٹھ جائے، میں بحث کرکے آپ کو منوا نہیں سکتا اور نہ ضرورت ہے اور دل سے غلاف اٹھانے کی صلاحیت بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔

نئے مداحوں کے ہجوم میں میری یہ سخت تنقید آپ کو اچھی نہیں لگے گی مگر اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں اور اپنی تلخ نوائی کی معافی مانگتے ہوئے اپنا خط ختم کرتا ہوں۔

(مولانا) مجیب اللہ ندوی۔ رشاد نگر۔ اعظم گڑھ

۲ رجب ۱۳۹۸ (۹ جون ۱۹۷۸)

جواب الرسالہ

۱۔ ہم تقریری مظاہروں کے خلاف ہیں نہ کہ نصیحت کے۔ ملت کے مسائل پر "احتجاجی کانفرنس" کرنا تقریری مظاہرہ ہے۔ جب کہ افراد قوم کے اندر تعمیری اور دینی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کرنا نصیحت ہے۔

۲۔ عیب نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر اس کی شخصیت کو مجروح کیا جائے۔ مگر الرسالہ میں اساسی امور پر تنقید ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی تنقید بلاشبہ غیر مطلوب ہے۔ جب کہ دوسری قسم کی تنقید عین مطلوب۔

۳۔ موجودہ زمانہ کی انقلابی تحریکوں پر ہماری تنقید یہ ہے کہ اسلامی تحریک کو عملاً انھوں نے سیاسی تحریک بنا دیا۔ اور اسلامی تحریک کی یہ تصویر یقیناً خدا کے دین میں اجنبی ہے۔

۴۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اجتماعی استحکام سے پہلے عملی سیاست میں کودنا صرف طاقت کے ضیاع کے ہم معنے ہے۔

۵۔ قادیانی تحریک کو سراہنے کی بات سراسر خلاف واقعہ ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اپنے آغاز میں باعتبار طریق کار اس کے اندر ایک صحیح رہنمائی تھی۔ وہ یہ کہ انگریز سے سیاسی تصادم نہ کرتے ہوئے غیر مسلموں اور خود انگریزوں میں دعوتی کام کیا جائے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ اس طریق کار (نہ کہ موجودہ قادیانیت) کی درستگی کے خلاف کون سی عقلی یا نقلی دلیل قائم کی جا سکتی ہے۔

۶۔ "موجودہ دور کے علوم کے حصول کو سب سے بڑا دینی کام"، ہم نے کب قرار دیا ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف یہ کہ وہ جدید دریافتیں جو اسلامی معتقدات کی تائید کرتی ہیں، ہم کو چاہئے کہ ہم انھیں جانیں اور ان کے ذریعہ اسلام کو مدلل کریں۔ دوسری چیز جس کو اپنانے پر ہم نے زور دیا ہے وہ عصری اسلوب کلام (سائنٹفک اسٹائل) ہے۔ سائنٹفک اسلوب سے مراد حقیقت نگاری کا اسلوب ہے، بمقابلہ خطیبانہ یا شاعرانہ یا بیانیہ اسلوب کے۔

۷۔ اسلامی تربیت میں عوام و خواص کی تقسیم بلاشبہ درست ہے۔ مگر اس تقسیم کو اسی حد تک محدود رہنا چاہئے جس کا نمونہ سنت رسول میں موجود ہے۔ بطور خود کسی کے لئے کوئی عبادتی طریقہ وضع کرنا بلاشبہ بدعت ہے خواہ وہ ایجاد ہو یا استنباط۔

۸۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی صحیح اسلامی طریقہ نہیں ہے کہ آدمی "شاعر اسلام" بن جائے اور ایسی تقریریں کرے جس سے ہر مذاق کے لوگ خوش رہیں۔ سچی بات کہہ کر غیر مقبول ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ عام پسند باتیں کہہ کر عوامی مقبولیت حاصل کی جائے۔

۹۔ الرسالہ کی تنقیدوں کو "نشتر زنی" کہنا انصاف کے خلاف ہے۔ الرسالہ میں ہمیشہ علمی اسلوب میں مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ نشتر زنی کو ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں جب کہ تجزیاتی تنقید اعلیٰ ترین دینی و ملی ضرورت ہے۔

۱۰۔ "تسکین نفس" اور "انتہائی خود نمائی کا مظاہرہ" وغیرہ کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدود تنقید سے باہر قدم رکھنا ہے۔ یہ نیت کو زیر بحث لانے کی بات ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ آدمی صرف یہ کر سکتا ہے کہ خارجی حقائق کو دیکھے اور دلیل کی زبان

میں ان کا تجزیہ کرے۔

۱۱۔ آپ نے راقم الحروف کے "گھریلو ماحول" پر بھی اعتراض کیا ہے۔ اگرچہ متعین طور پر آپ نے نہیں بتایا کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ تاہم میں آپ کو یا کسی بھی مرد یا عورت کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ میرے گھر میں آکر ایک مہینہ یا اس سے زیادہ مدت تک قیام کرے اور دیکھے کہ میں اور میرے گھر کے لوگ کس طرح رہتے ہیں۔ جو دین میں نے قرآن و حدیث میں پڑھا ہے اس کے مطابق میں اس کو حرام سمجھتا ہوں کہ قطعی معلومات کے بغیر کسی کو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں متہم کیا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو شخص اس قسم کی ذمہ داری لینا چاہتا ہو وہ اس سے پہلے اس کی براہ راست تحقیق بھی کرے۔

☆ ☆

تعارف و تبصرہ

آسان قرآن (مترجم)

ناشر: ورلڈ قرآن سوسائٹی

۱۸ پیلا تالاب، رام پور (یوپی)

مذکورہ ادارہ ایک نان کمرشیل ادارہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ "قرآن کا ترجمہ مختلف قوموں کی زبان میں شائع کیا جائے۔ اور اس کام سے کوئی دنیوی فائدہ پیش نظر نہ ہو۔ مزید یہ کہ قرآن کا ترجمہ آسان زبان میں ہو۔ ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ آسان ہوتے ہوئے اصل کا اثر قائم رکھے"۔ زیر نظر "آسان قرآن" اسی کوشش کا پہلا جزء ہے۔ ادارہ کا منصوبہ یہ ہے کہ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں اسی طرح سادہ اور آسان ترجمے شائع کئے جائیں۔ ترتیب یہ ہے کہ دائیں صفحہ پر متن ہے اور بائیں صفحہ پر ترجمہ

اس میں شک نہیں کہ زیر نظر ترجمہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے، وہ سادہ بھی ہے اور مؤثر بھی۔ زیر نظر حصہ پانچ پاروں کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح بقیہ حصے شائع کئے جائیں گے۔ تبصرہ نگار کے لئے اس تجویز سے اتفاق مشکل معلوم ہوتا ہے۔ غالباً زیادہ بہتر صورت یہ ہوتی کہ پورا قرآن ایک ہی جلد کی صورت میں شائع کیا جاتا۔ کتابت کو کم جلی کرکے ضخامت گھٹائی جاسکتی ہے۔ عمدہ کتابت کے ساتھ باریک کاغذ پر ایک جلد کی صورت میں اگر اس کو شائع کیا جائے تو موجودہ صورت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مفید ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ اس پر مترجم کا نام درج نہیں ہے۔ ذاتی طور پر مجھے معلوم ہے کہ یہ ترجمہ مولانا محمد فاروق خاں ایم اے نے کیا ہے، موصوف اس سے پہلے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد علمی و دینی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اگر ان کا نام ترجمہ میں دے دیا جائے تو یقیناً اس کے استناد میں اضافہ کا باعث ہوگا

اسلام میں حلال و حرام

صفحات: ۴۳۲ قیمت پندرہ روپے

پتہ: الدار السلفیہ، حامد بلڈنگ، مومن پورہ مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۱۱

مشہور عرب عالم یوسف قرضاوی کی کتاب ہے جس کا نام ہے الحلال والحرام فی الاسلام۔ زیر نظر کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا شمس پیرزادہ نے کیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع اور تحقیقی ہے۔

خدا کی خدائی کا کم تر اندازہ

بعض اسلامی حلقے اپنے افراد کو منع کر رہے ہیں کہ وہ الرسالہ کا مطالعہ نہ کریں۔ ایسا کرکے وہ دراصل اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ الرسالہ کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ان لوگوں کا تصورِ خدا بھی کیسا عجیب ہوگا جو اپنے اندر اس بات کی ہمت پاتے ہوں کہ وہ عالم الغیب کا سامنا اس حال میں کریں کہ انھوں نے ایک ایسے دین کو پکڑ رکھا تھا جس کی بابت انھیں خود یہ شبہ تھا کہ کتاب وسنت کے کافی دلائل اس کے حق میں موجود نہیں ہیں اور اُس پیغام کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں جو واضح دلائل کے ساتھ اُن کے سامنے آیا تھا۔ ایسے واضح دلائل جن کی بابت وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انھوں نے ان کو اپنے ذہن میں داخل ہونے دیا تو وہ اُن کے "عقائد" کو متزلزل کر دیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا حیرت ناک حد تک کمتر اندازہ کر رہے ہیں۔

۱۹۷۷ میں ہندستان میں مختلف سیاسی پارٹیوں نے مل کر جنتا پارٹی بنائی۔ اسی زمانہ میں پاکستان میں نو سیاسی پارٹیوں نے مل کر "پاکستان قومی اتحاد" قائم کیا۔ اول الذکر کا مقصد مسز اندرا گاندھی کو اقتدار سے ہٹانا تھا اور ثانی الذکر کا مقصد مسٹر بھٹو کو۔ جب تک اپنے سیاسی حریف کو "ہٹانے" کا سوال تھا، دونوں ملکوں کی جماعتیں باہم متحد رہیں۔ مگر جب یہ مرحلہ طے ہوگیا تو اب دونوں ملکوں کا سیاسی اتحاد، اختلاف و انتشار کا شکار ہو رہا ہے ——— منفی نعرہ انھیں متحد کر سکتا تھا۔ مگر مثبت مقصد ان کو متحد کرنے میں ناکام رہا۔

مختلف سیاسی چھتریوں کے ملنے سے اتحاد کی جو بڑی چھتری بنی تھی وہ پارہ پارہ ہو رہی ہے کیوں کہ ہر ایک اپنی اپنی چھتری کو الگ کرکے اس کے سایہ میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔

عورت اور مرد کا فرق
حیاتیاتی بناوٹ میں فرق
کا نتیجہ ہے
نہ کہ محض سماجی اسباب کا

Why Women Are Second-Rate

As an ardent supporter of equal opportunities for women I am constantly nagged by doubts about their creative ability. How is it that women have produced so few writers, poets, composers, artists of top calibre? How is it that even in professions which are traditionally regarded as theirs, e.g. cooking and dress-designing, men beat them to the second place. All the famous chefs and dressmakers (even women's wear) are men. Hitherto I had accepted the sociologist's point of view that it was tradition and environment that militated against them. Somehow the sociological answer did not carry total conviction and I felt there was more than environment and lack of opportunity behind women's second-ratedness.

Professor H. J. Eysenck who invented the Intelligence Quotient (I.Q.) tests and pronounced that the black and brown races had a lower I.Q. than the white has now proclaimed the same about women. Their genes make them what they are; from the time of conception their feminineness is programmed as in a computer. It is not, as sociologists maintain, tradition or environment which makes a female child to play with dolls while her brother plays with toy soldiers but her biological constitution. Even within the womb, the female develops a broader pelvis than the male. The broader the pelvis, the more feminine will its possessor be, says Eysenck. Males with broad pelvises tend to be feminine, passive, even homosexual. Females with narrow pelvises tend to be masculine, aggressive, even lesbian. Random sampling amongst your own acquaintances will confirm some of Eysenck's postulates.

Eysenck had earlier brought the wrath of the champions of racial equality on his head. Now women libbers are out for his scalp with their rolling pins.

The Illustrated Weekly of India
April 2, 1978

عورتوں کو مساوی مواقع دیئے جانے کے ایک پرجوش حامی کی حیثیت سے میں مسلسل طور پر ان کی تخلیقی صلاحیت کے بارے میں شبہ کا شکار رہا ہوں۔ ایسا کیوں ہے کہ عورتوں نے اعلیٰ درجہ کے ادیب، شاعر، آرٹسٹ اتنی کم تعداد میں پیدا کئے۔ ایسا کیوں ہے کہ ان شعبوں میں بھی جو روایتی طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، مثلاً طباخی اور لباس سازی، وہ مردوں کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر ہیں۔ تمام مشہور طباخ اور لباس ساز (حتیٰ کہ عورتوں کے لباس کے بھی) مرد ہی ہیں۔

اب تک میں سماجی علماء کے اس نقطۂ نظر کو مانتا رہا ہوں کہ یہ روایت اور ماحول ہے جس نے ان کے خلاف کام کیا ہے۔ مگر سماجی توجیہہ سے مجھے پورا اطمینان نہ ہو سکا۔ میں محسوس کرتا رہا کہ ماحول یا مواقع کے فقدان کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہیں جنھوں نے عورتوں کو مردوں سے پیچھے کر رکھا ہے۔

پروفیسر آئی سنک جنھوں نے ذہانت کا حسابی پیمانہ ایجاد کیا ہے، اور جن کا کہنا ہے کہ کالے اور سانولے رنگ کی نسلیں، سفید فام نسلوں کے مقابلہ میں کم تر ذہانت رکھتی ہیں، اب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہی بات عورتوں کے لئے بھی صحیح ہے۔ ان کے جین دراصل ان کو بناتے ہیں۔ حمل کے وقت ہی سے ان کا زنانہ پن اسی طرح متعین اور مقرر ہوتا ہے جس طرح کسی کمپیوٹر میں۔ علمائے سماجیات کے دعوی کے برعکس، یہ روایت اور ماحول کا اثر نہیں ہے کہ ایک چھوٹی بچی گڑیوں کے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے اور ایک چھوٹا بچہ سپاہی کی صورت والے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ یہ حیاتیاتی بناوٹ کا اثر ہے۔ حتیٰ کہ ایک لڑکی جب کہ ابھی وہ رحم مادر میں ہوتی ہے وہ لڑکے کے مقابلہ میں زیادہ کشادہ پیڑو بنانے

لگتی ہے۔ پیڑو جتنا زیادہ کشادہ ہوگا، اتنا ہی اس میں زنانہ پن زیادہ ہوگا۔ یہ بھی پایا گیا ہے کہ جن مردوں کے پیڑو چوڑے ہوتے ہیں ان میں زنانہ پن، انفعالیت، حتیٰ کہ ہم جنسی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جن عورتوں کے پیڑو کم چوڑے ہوتے ہیں ان میں مردانہ اوصاف جارحیت اور ہم جنسی کے رجحانات ہوتے ہیں۔ یہ تجربات اتنے قطعی ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے قریبی لوگوں کا جائزہ لے کر ان کی تصدیق کرسکتا ہے۔

آئی سنک اس سے پہلے نسلی مساوات کے حامیوں کا نشانہ تنقید رہا ہے۔ اب مساوات نسواں کے حامیوں نے بھی اس کے خلاف قلم اٹھالیا ہے اور اس پر سخت تنقیدیں کی جارہی ہیں ــــ خشونت سنگھ

موت کے دوسری طرف

ہر شخص پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو موت کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے گا۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ چھوڑ چکا، جس میں اب وہ واپس نہیں جاسکتا۔ اور سامنے وہ عالم ہوگا جس میں اب اسے داخل ہونا ہے، جس میں داخلہ سے وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔

یہ فیصلہ کن روز ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ اس دن حیرت انگیز طور پر آدمی دیکھے گا کہ وہ اپنی اصلی صورت میں بے نقاب کردیا گیا ہے۔

قیامت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (جب پنڈلی کھولی جائے گی) عوفی نے اس آیت کی تشریح میں عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے:

حین یکشف الامر وتبدو الاعمال (ابن کثیر) جب معاملہ کھل جائے گا اور اعمال ظاہر ہوجائیں گے۔ دنیا میں ہر آدمی اپنے آپ کو ایک مصنوعی خول میں چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کے اوپر خوبصورت الفاظ کا ایک پردہ ڈال لیتا ہے۔ آخرت میں یہ چیزیں ہٹ جائیں گی۔ ہر آدمی اپنی حقیقی صورت میں سامنے آجائے گا۔

دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی جو حقیقۃً خود پرست ہو وہ اپنے کو خدا پرست ظاہر کرے۔ اس کو اپنے جاہ و مرتبہ سے دلچسپی ہو مگر دنیا کے سامنے وہ اپنے کو اس انداز میں پیش کرے، گویا وہ حق کا علم بردار ہے، ذاتی مصلحتیں اور ذاتی مفادات اس کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہوں مگر اپنی تقریر و تحریر سے وہ لوگوں پر ایسا جادو کرے کہ لوگ اس کو مجاہد اعظم سمجھنے لگیں۔

مگر موت انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس قسم کی تمام چیزوں کو باطل کردیتا ہے۔ موت کے بعد آدمی جس دنیا میں پہنچتا ہے، وہاں اچانک اس قسم کے تمام لبادے اس کے اوپر سے اتر جاتے ہیں۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی صورت میں سامنے آجاتا ہے، اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔

تین ڈالر کے سوڈالر

ایک بیرل تیل جو خلیج فارس میں تین ڈالر کا خریدا جاتا ہے۔ وہ یورپ میں صارف کو ۴۵ ڈالر میں بیچا جاتا ہے اور کیمیائی مصنوعات کی صورت اختیار کرنے کے بعد اس کی قیمت سو ڈالر تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلام کے خلاف جدید شبہات کو ڈھا دینے والی کتاب

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۶ر فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت كتابك الاسلام يتحدى (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔

الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی وشافی رد موجود ہے۔

قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔۔۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدی بلاشک وشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

قیمت: تیرہ روپے پچاس پیسے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

دین کیا ہے

از

مولانا وحید الدین خاں

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
سال اشاعت ۱۹۷۸

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ٦

فہرست

دین کیا ہے :

دین کی حقیقت	۲
ارکان خمسہ	۳
روزمرہ کی زندگی میں	۵
اشاعت دین	۷
ہجرت ، جہاد	۸
غلبۂ اسلام	۹
خلاصہ	۱۰

دینی روح کیوں نہیں :

مومن کون ہے	۱۲
تحریف (غلط تعبیر)	۱۳
حقائق کے بجائے خوش خیالیاں	۱۴
خالق کے بجائے مخلوق کا سہارا	۱۶
معانی کے بجائے صورتیں	۱۸
دعا کے بجائے عملیات	۲۰
انفرادی حکم کو اجتماعیات کی طرف موڑنا	۲۲
اتحاد کے بجائے اختلاف	۲۵

ورنہ ہم سنت الٰہی کی زد میں آجائیں گے :

بنی اسرائیل کی مثال	۲۸
مسلم تحریکیں	۲۹
نجات کی واحد صورت	۳۱

اسلامی لٹریچر	۳۲

دین کیا ہے

دین کے معنی ہیں ذلیل ہونا، فرماں برداری کرنا۔ قومٌ دینٌ: فرماں بردار لوگ۔ حدیث میں ہے۔ الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت (عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے اور موت کے بعد کے لئے عمل کرے) دین اسلام سے مراد زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکائے ہوئے ہو۔ وہ خدا کا ایسا تابعدار بن جائے کہ اس کے جذبات و احساسات تک خدا کے آگے بچھ جائیں۔ نفسیاتی سطح پر دین جس چیز کا نام ہے، مندرجہ ذیل آیت اس کی مکمل تفسیر پیش کر رہی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

عنکبوت ۶۴-۶۶

دنیا کی زندگی تو کھیل تماشا ہے اور اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اگر وہ اس کو جانیں۔ پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرکے اس کو پکارنے لگتے ہیں اور جب وہ ان کو بچا کر خشکی پر لاتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ اللہ کے دیئے ہوئے پر کفر کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ عنقریب وہ جان لیں گے۔

جب آدمی کی کشتی سمندر میں ہوتی ہے اور موجوں کے درمیان گھر جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو بالکل بے یار و مددگار محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود مکمل طور پر خدا کے اوپر منحصر ہے۔ اپنی بے بسی کے سوا اس وقت اس کو کچھ یاد نہیں رہتا، وہ دل و جان سے خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب وہ سمندر کی لہروں سے بچ کر نکل آتا ہے اور خشکی پر پہنچ جاتا ہے تو تو اس کا حال بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ اب وہ دنیوی چیزوں میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عاجزانہ حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ اور کبر و انانیت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ خدا اور آخرت کے بجائے دنیا اور دنیا کے مشاغل اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن جاتے ہیں —— پہلی حالت دین داری کی حقیقت کو بتا رہی ہے اور دوسری حالت بے دینی کی حقیقت کو۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی کا نفسیاتی وجود پوری طرح خدا کے آگے جھک گیا ہو۔ وہ خدا کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگا ہو۔ اس کے مقابلہ میں بے دینی یہ ہے کہ آدمی کے اندر ڈھٹائی ہو۔ آج کی دنیا میں گم ہو کر وہ کل کی دنیا کو بھول جائے۔

دین کی اس حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لئے یہاں قرآن کے چند حوالے درج کئے جاتے ہیں:

(یوسف نے کہا) میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا دین اختیار کیا ہے۔ ہمارے لئے روا نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے قید خانہ کے ساتھیو،

بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست۔ اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو بس نام ہیں کہ تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری۔ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ اس نے فرمادیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (یوسف)

اور اہل کتاب واضح بیان آنے کے بعد متفرق ہو گئے۔ حالاں کہ ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے، بالکل یک سو ہو کر۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور یہی ہے درست دین۔ (بینہ ۵-۴)

تم سیدھا رکھو اپنا منھ دین کی طرف یک سو ہو کر۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو۔ یہی ہے درست دین۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اللہ کی طرف رجوع ہو کر اس سے ڈرتے رہو۔ اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے (روم ۳۲-۳۰)

ان آیات کے مطابق دین نام ہے اللہ کو دل سے ماننے کا، ہر قسم کے شرک سے بچنے کا، آخرت کو اپنی منزل مقصود بنانے کا، اللہ کا شکر گزار بن جانے کا، اللہ کو سارے اختیارات کا مالک جاننے کا، صرف اسی کی عبادت کرنے کا، نماز روزہ کی ادائگی کا، خدا کی طرف یکسو ہونے کا، فرقہ بندیوں سے بچنے کا، اپنے خود ساختہ دین پر مگن رہنے کے بجائے اللہ اور رسول کے دین کو پکڑنے کا۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنے، وہی سچی دینی زندگی ہے اور مختلف معاملات میں ان کیفیات و اعمال سے مطابقت رکھنے والا جو رویہ ابھرے وہی دینی رویہ ہے۔ گویا دین یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر خدا کا ہو جائے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز اس کی عقیدت اور اعتماد کا مرکز نہ رہے۔

ارکان خمسہ

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ دین اسلام کے ارکان پانچ ہیں: کلمہ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

دین میں داخلہ جہاں سے شروع ہوتا ہے، وہ کلمہ کا اقرار ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه۔ اس کلمہ میں دو باتیں ہیں۔ اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت۔ یعنی خدائی کی تمام اوصاف کے ساتھ اللہ ہی کو خدا ماننا۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا وہ مستند نمائندہ ماننا جس سے حقیقت کی معرفت اور خدا کی مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ کلمہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کا صرف لسانی تلفظ کرلینا کافی ہو۔ یہ ایک سنجیدہ فیصلہ کا اعلان ہے۔ یہ ایک طرف اپنے آقا (خدا) اور دوسری طرف اپنے رہنما (رسول) کو پالینے کا اظہار ہے۔ یہ پوری زندگی کا عہد نامہ ہے جو بندہ اپنے خدا کو گواہ بنا کر کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک ایمان وہی ہے جو داخل القلب ایمان (حجرات) ہو۔ محض زبان سے ان الفاظ کو بول دینا خدا کے یہاں معتبر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں بہت سی ایسی چیزوں کو

"ایمان" میں شمار کیا گیا ہے جن کا تعلق بظاہر عمل سے ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔ کلمہ کا اقرار اگر ایک سنجیدہ فیصلہ کے طور پر ظہور میں آئے تو وہ آدمی کی پوری زندگی میں روح بن کر شامل ہو جائے گا۔ بصورت دیگر اس کی حیثیت ایک ایسے لفظی ضمیمہ کی ہوگی جس کا آدمی کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس اقرار کے بعد سب سے پہلا فریضہ نماز ہے۔ نماز اسلام کی سب سے اہم عبادت ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ ہر نماز سے پہلے ہاتھ منھ اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں جس کو وضو کہتے ہیں۔ نماز میں مختلف آداب اور کلمات اور دعاؤں کو ادا کرتے ہوئے بندہ اپنے مالک کے آگے جھکتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو جوڑتا ہے۔ قیام اور رکوع اور سجدہ گویا خدائی کے سامنے اپنی بندگی کا عملی اعتراف ہے۔ اس طرح بندہ اپنے آپ کو اس مقام عبدیت پر لے جاتا ہے جہاں اس کا خدا اس سے ملاقات کر سکے۔ بندہ اپنے رب کو عجز کی سطح پر پاتا ہے نہ کہ کبر اور انانیت کی سطح پر۔

روزہ سال میں ایک مہینہ کے لئے ماہ رمضان میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا وقت ابتدائے سحر سے شروع ہوتا ہے اور سورج ڈوبنے تک رہتا ہے۔ اس دوران میں کھانا پینا مطلق چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق روزہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ کے اندر تقویٰ اور شکر (بقرہ) کی کیفیت پیدا ہو۔ کھانا اور پانی آدمی کی سب سے بڑی ضرورتیں ہیں۔ جب پیاس سے آدمی کا حلق سوکھ جاتا ہے۔ جب بھوک سے آدمی کا سینہ کھرچنے لگتا ہے اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا کمزور ہے اور خدا کی مدد کا کتنا زیادہ محتاج ہے۔ یہ تجربہ اس کو اللہ کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس دلاتا ہے جو کہ تقویٰ کا حاصل ہے۔ پھر شام کو جب وہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو وہ اس بات کا تجربہ کرتا ہے کہ اس کے خدا نے کتنی مکمل صورت میں اس کی ضرورتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس کا دل احسان مندی کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کی زبان پر حمد اور شکر کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

زکوٰۃ مال اور پیداوار میں خدا کا حق ہے۔ ہم دنیا میں جو کچھ کماتے ہیں خواہ وہ مویشی اور زمین کے ذریعہ ہو یا کارخانہ اور دکان کے ذریعہ یا ملازمت اور مزدوری کے ذریعہ، اس میں "ہمارا" حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ ہمارے اندرونی نظام سے لے کر کائنات تک بے شمار اسباب جب ہماری موافقت میں اکٹھا ہوتے ہیں تب ہم کوئی کمائی کر پاتے ہیں۔ یہ اسباب براہ راست مالک ارض و سما کی طرف سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ سال کے آخر میں جب ہم اپنی کمائیوں کا حساب کریں تو اس کا ایک حصہ خدا کی راہ میں نکال کر اس واقعہ کا اعتراف کریں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اگر وہ ہماری مدد پر نہ ہوتا تو ہم کسی قسم کی کوئی کمائی نہیں کر سکتے تھے۔ زکوٰۃ یا انفاق دراصل تعلق کی اس اعلیٰ کیفیت کا مظہر ہے جب کہ بندہ بے قرار ہو کر چاہنے لگتا ہے کہ اپنے آقا کے سامنے اپنے آپ کو خالی کر دے۔

اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل ایمان جب کسی کو دے رہے ہوتے ہیں تو ان کی زبان حال پکار رہی ہوتی ہے: ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکرانہ نہیں چاہتے۔ یہ تو ہم صرف اللہ کے لئے خرچ کر رہے ہیں۔ (انسان ۹)

حج ایک سالانہ عبادت ہے جو کسی شخص پر زندگی میں ایک بار کے لئے فرض ہے۔ یہ فرض بھی اس وقت ہے جب کہ وہ اپنے مقام سے سفر کرکے حجاز جانے اور وہاں سے واپس آنے پر قادر ہو۔ اور اس کے مواقع رکھتا ہو۔ بصورت دیگر اس پر حج فرض نہ ہوگا۔ حج کے مقامات وہ مقامات ہیں جہاں اسلام کی تاریخ بنی ہے۔ وہاں وہ جگہیں ہیں جہاں پیغمبروں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ جہاں ان کی قربانیوں کی یادگاریں ہیں، جہاں سے شرک کو دائمی طور پر خارج کر دیا گیا ہے۔ وہ واحد مقام ہے جہاں تاریخ انسانی میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ لادینیت کو مغلوب کرکے دین کو قیامت تک کے لئے غالب کر دیا گیا۔ ان آثار سے بھرے ہوئے جغرافیہ کو اس بات کے لئے منتخب کیا گیا ہے کہ ساری دنیا کے اہل اسلام ہر سال یہاں جمع ہوں اور سب مل کر اللہ کی عبادت کریں۔ اسلامی اتحاد کا سبق لیں۔ وہاں کی فضاؤں سے نیا ایمانی عزم اور نیا دینی شوق لے کر اپنے وطن کو لوٹیں۔ حج بتاتا ہے کہ کس طرح سارے انسانوں کو اللہ کے گرد جمع ہو جانا چاہئے۔

روزمرّہ کی زندگی میں

مذکورہ پانچ ارکان قرآن کے الفاظ میں دین کے معلوم اور موقوت ارکان ہیں۔ مگر جب ایک شخص کی زندگی میں دین شامل ہوتا ہے تو وہ صرف متعین اوقات کے اعمال تک محدود نہیں رہتا وہ اس کی پوری زندگی میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کے ہر رویہ سے اس کا اظہار ہونا رہتا ہے۔ قرآن وحدیث سے اس سلسلے میں جو چیزیں معلوم ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلی چیز ذکر ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو (آل عمران ۱۹۱) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہاری زبان کو ہر وقت ذکر الٰہی میں تر رہنا چاہئے (لایزال لسانک رطبا من ذکر اللہ)۔

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق اتنا بڑھا ہوا ہونا چاہئے کہ آدمی کو ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ یہ ذکر وہ روحانی تار ہے جس کے ذریعہ سے کوئی بندہ اپنے رب سے دائمی ربط (CONSTANT TOUCH) میں رہتا ہے۔ کبھی دنیا میں اللہ کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اللہ کی قدرت وکبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اللہ کے احسانات کو یاد کرکے اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ کبھی قیامت کی بازپرس کا خوف اس کو تڑپاتا ہے اور وہ اللہ سے بخشش طلب کرنے لگتا ہے۔ کبھی اپنے عجز کا احساس اس کو ابھارتا ہے کہ وہ اللہ سے رحمت ونصرت کی درخواست کرے۔ غرض اس کے حساس قلب میں ہر آن کوئی نہ کوئی ایسی شورش برپا رہتی ہے جو اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے اپنے رب کو پکارتا رہے۔ (اعراف ۲۰۵)

اس ذکر کا نہ کوئی نصاب ہے۔ نہ اس کے الفاظ مقرر ہیں اور نہ اس کی کوئی لگی بندھی صورت ہے۔ یہ تو خدا کی اُس آفاقی دنیا میں غوطہ لگانا ہے جہاں تمام تعینات ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر اس کو متعین شکلوں میں محدود کس طرح

کیا جا سکتا ہے ـــــ اللہ کو یاد کرتے ہوئے قرآن میں تدبر کرتے ہوئے۔ کائنات میں غور کرتے ہوئے، اپنا احتساب کرتے ہوئے، موت اور آخرت کو سوچتے ہوئے بار بار مومن کا جی بھر آتا ہے اور کبھی دل میں اور کبھی زبان سے اس کے اثرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ کی یاد گرم گرم آنسوؤں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑتی ہے۔ یہ ہے ذکر اور یہ ذکر قرآن کے مطابق سب سے بڑی عبادت ہے (عنکبوت ۴۵)

دوسری چیز نُصح (خیر خواہی) ہے۔ اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحۃ (دین خیر خواہی کا نام ہے) مومن ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ نفرت، بغض، حسد، کینہ اور انتقام سے اس کا سینہ خالی ہوتا ہے۔ وہ ہوا کی مانند ہوتا ہے جو سب کے درمیان سے ٹکرائے بغیر گزر جاتی ہے۔ وہ سورج کی مانند ہوتا ہے جو کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کے اوپر چمکتا ہے۔ وہ چڑیوں کی مانند ہوتا ہے جن کے دل میں کسی کے خلاف غصہ اور انتقام نہیں ہوتا۔ مومن خدا کا وہ بندہ ہے جو اپنے کو خدا سے ملا لے۔ وہ بندوں کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے لوگوں کا خالق انھیں دیکھ رہا ہے۔ ایسا شخص، حدیث کے الفاظ میں، اخلاق خداوندی کا پیکر بن جاتا ہے جس کو اپنے تمام بندوں سے یکساں پیار ہے نہ کہ شیطانی اخلاقیات کا جس کو صرف "اپنے لوگوں" سے دلچسپی ہوتی ہے۔ بقیہ انسانوں کے لئے اس کے پاس نفرت اور عداوت کے سوا اور کچھ نہیں۔

تیسری چیز قسط (انصاف) ہے۔ یعنی دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں ہمیشہ عدل و انصاف پر قائم رہنا۔ قرآن میں مسلمانوں کو انصاف کا حکم دیا گیا ہے (اعراف ۲۹) نیز فرمایا گیا کہ تم لوگ انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو (نساء ۱۳۵) جو چیزیں آدمی کو انصاف کے راستہ سے ہٹاتی ہیں، ان کی نشان دہی کر کے تاکید کی گئی ہے کہ تم لوگ کسی حال میں انصاف سے نہ ہٹو۔ آدمی تعلقات کے پاس و لحاظ میں انصاف سے ہٹ جاتا ہے۔ فرمایا کہ قرابت داری کا معاملہ ہو تب بھی عدل و انصاف پر قائم رہو (انعام ۱۵۲) ذاتی مفادات و خواہشات کبھی آدمی کو انصاف سے ہٹا دیتی ہیں۔ فرمایا کہ خواہش نفس کا تقاضا ہو تب بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو (نساء ۱۳۵)۔ بغض اور نفرت میں آدمی انصاف کے حدود کو بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ کسی سے تمھاری دشمنی ہو جائے تب بھی تم اس کے ساتھ انصاف ہی کرو۔ کیونکہ یہی روش تقویٰ کے مطابق ہے (مائدہ ۸)

انصاف کا سب سے زیادہ آسان اور قطعی معیار، حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ حتیٰ کہ فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایمان ہی نہیں جو اپنے لئے کچھ اور چاہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور (لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ)

اشاعت دین

دین کسی دین دار کے اندر جو خصوصیات پیدا کرتا ہے، ان میں سے ایک ہے —— دین کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس پہنچانے کی دو صورتیں ہیں۔ قرآن میں ایک کو تذکیر اور دوسرے کو انذار (اعراف ۲) کہا گیا ہے۔ اول الذکر کا تعلق مسلمانوں سے ہے، دوسرے کا غیر مسلموں سے۔

تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا۔ اس سے مراد مسلمانوں کو نصیحت و موعظت کرنا ہے۔ مسلمان وہ لوگ ہیں جو دین کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ ان کو دینی ذمہ داریوں سے باخبر کرنا، ان کو خود اپنے عہد کو یاد دلانا ہے۔ اسی لئے اس کو تذکیر کا نام دیا گیا ہے۔

تذکیر کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح (نساء ۱۱۴) ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ان تمام آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو اصلاحی مہم کو نتیجۃً فساد کی مہم نہ بنا دے —— غلطی پر گرفت میں نرمی کا انداز (آل عمران ۱۵۹) اختیار کیا جائے نہ کہ سخت سست کہنے کا۔ سورہ نحل آیت ۱۲۵ میں بتایا گیا کہ مدعو سے جو بات کہی جائے حکمت کے ساتھ کہی جائے، یعنی دلائل و براہین کی زبان میں ہو نہ کہ محض تحکمانہ انداز میں۔ وہ موعظت حسنہ ہو، یعنی گفتگو میں شفقت اور دل سوزی کی روح بھری ہوئی ہو۔ وہ جدال احسن کے پیرایہ میں ہو، یعنی بحث میں تفہیم اور احقاق حق کا انداز ہو نہ کہ ایک دوسرے پر الزام لگانے اور نیچا دکھانے کا۔

تذکیر کا کام اگر حکمراں طبقہ پر انجام دینا ہو تو مسئلہ اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ غلط انداز تذکیر سے اگر حکمرانوں کو مشتعل کر دیا جائے تو وہ مسلمانوں کا قتل و خون شروع کر دیں گے اور مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی اور قتل کا وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ ہر قیمت پر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے بارے میں خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے کہ ان کو نصیحت کی جائے تو تنہائی میں کی جائے نہ کہ نعروں اور تقریروں کے ذریعہ:

سئل ابن عباس رضی اللہ عنہما عن امر السلطان بالمعروف ونهيه عن المنكر فقال: ان كنت فاعلا ولا بد ففيما بينك وبينه

ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۷۱

عبد اللہ بن عباس رض سے پوچھا گیا کہ بادشاہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا کیا حکم ہے۔ جواب دیا اگر تم کو کرنا ہی پڑے اور اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو بس اپنے اور اس کے درمیان۔

اس سلسلے کی دوسری چیز انذار ہے۔ انذار کے معنی ہیں کسی خطرہ سے آگاہ کرنا، چیتاونی دینا۔ اس سے مراد غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے۔ چوں کہ اسلام کی پیغام رسانی میں سارا زور آخرت کے مسئلہ پر ہوتا ہے، اس لئے اس کام کو بتانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرمایا کہ وہ تو صرف

ایک عذاب شدید کی چیتاونی دینے والے ہیں (سبا ۴۶)۔ ارشاد ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ (شوریٰ ۷)

اور ہم نے عربی قرآن اتارا تاکہ تو ڈرا دے مکہ والوں کو اور دوسروں کو اور ان کو جمع ہونے کے دن کی خبر دے دے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اس دن ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔

انذار کے کام کے محرک قرآن کے الفاظ میں دو ہوتے ہیں۔ نصیحت (خیر خواہی) اور امانت (اعراف ۶۸) بندۂ مومن دوسرے بندگان خدا پر دین پہنچانے کا جو کام کرتا ہے وہ تمام تر اس جذبہ کے تحت ہوتا ہے کہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچ جائیں اور جنت کے راستہ پر چلنے لگیں۔ اللہ کا دین جو اس کے پاس ہے، اس کو وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی امانت سمجھتا ہے اور اپنے اوپر خدا کا یہ فرض سمجھتا ہے کہ اس امانت کو وہ اس کے امانت داروں (عام انسانوں) تک پہنچا دے۔

ہجرت ، جہاد

جب بھی کوئی خدا کا بندہ بے آمیز خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرف سے اس کو ناموافق ردعمل کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ردعمل ابتداءً الغا فی الکلام (فصلت ۲۶) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی داعی کے کلام میں عیب نکالنا۔ حق کی دعوت کے ساتھ خدا کی نصرتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی ماحول میں اٹھتی ہے تو اتنی حقیقی اور اتنی مدلل ہوتی ہے کہ سننے والے اس میں کوئی واقعی خامی نکالنے میں اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ عیب نکالنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو اس سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فکری کش مکش کبھی عملی ٹکراؤ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ٹکراؤ اہل ایمان کے لئے جو صورتیں پیدا کرتا ہے انھیں کی آخری اور انتہائی صورتوں کا نام ہجرت اور جہاد ہے۔ گویا ہجرت اور جہاد دین کے وہ اجزاء ہیں جو مخالفین کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ظہور میں آتے ہیں۔

ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا۔ ابتدائی طور پر اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے (مدثر ۵)۔ مگر اپنے آخری مرحلہ میں یہ کبھی گھر بار چھوڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ داعی کے مقابلہ میں مدعو ہمیشہ طاقت ور حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے جب وہ مخالفت پر اترتے ہیں تو تمام دوسرے طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر یہ چیلنج دے دیتے ہیں کہ تم یا تو اپنے دین کو چھوڑ دو یا ہماری زمین سے نکل جاؤ (ابراہیم ۱۳) اس وقت اللہ کے بندے اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر چلے جاتے ہیں جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

جہاد کے معنے ہیں کوشش کرنا۔ حق کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے، وہ بھی جہاد ہے (فرقان ۵۲)۔ تاہم مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی کبھی بڑھ کر اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ حق کے داعیوں کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں، وہ ان کو بالکل مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اہل حق کو اپنے بچاؤ کے لئے اٹھنا

پڑتا ہے۔ اس طرح جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کو جہاد کہتے ہیں۔

جہاد بمعنی قتال، وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں دفاعی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے شرائط میں سے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا اولاً دوسروں کی طرف سے کی گئی ہو (توبہ ۱۳)۔ اہل ایمان کے لئے ہر حال میں پرامن تبلیغ کا حکم ہے۔ جنگ کی اجازت ان کے لئے صرف اس صورت میں ہے جب کہ ان کو جنگ کے لئے مجبور (حج ۳۹) کر دیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ اور بھی شرطیں ہیں ——— مسلمانوں کی قوت مجتمع ہو، ان کا ایک امیر ہو۔ جس کی تمام لوگ اطاعت کرتے ہوں، وہ منکرین کی بستی سے الگ ہو کر اپنا ایک اجتماعی مرکز بنا چکے ہوں۔ وہ صبر کی صفت اس حد تک اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں کہ قلیل تعداد ہوتے ہوئے مخالفین کی کثیر تعداد سے جم کر مقابلہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں مکی دور میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کی اجازت صرف مدینہ میں ملی جب کہ مذکورہ شرائط پوری ہو چکی تھیں۔ عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق ستر سے زیادہ بار قتال کی ممانعت آتی رہی۔ اس کے بعد سورۂ حج میں اجازت قتال کی پہلی آیت نازل ہوئی۔

غلبۂ اسلام

دین کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے خوف و محبت کا تعلق جوڑے اور آخرت کی کامیابی کے لئے فکر مند ہو۔ مگر دنیا کی زندگی میں مومن کی ایک اور بھی پسندیدہ چیز (صف ۱۳) ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اسلام کا غلبہ۔ یعنی اہل حق دوسری قوموں کے مقابلہ میں دبے ہوئے نہ ہوں بلکہ انھیں کو زمین کے اوپر سربلندی حاصل ہو۔

تاہم اہل ایمان کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ براہ راست اسلامی اقتدار قائم کرنے کی مہم چلائیں۔ قرآن میں واضح لفظوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اقتدار کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے (آل عمران ۲۶)۔ انبیاء میں سے کسی نبی نے بھی حکومت قائم کرنے کی مہم نہیں چلائی۔ حضرت داؤدؑ کو حکومت ملی۔ مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اے داؤد تم کو یہ اقتدار ہم نے عطا کیا ہے (ص ۲۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی بابت قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ
لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان کو وہ زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ اگلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے ڈر کو امن سے بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے اس کے بعد جو ناشکری کرے گا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ تم

وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ — لوگ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (نور ۵۵)

گویا مسلمان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نماز قائم رکھے، بالفاظ دیگر اللہ سے لپٹا رہے۔ زکوٰۃ ادا کرے، یعنی بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں مستعد ہو۔ رسول کی اطاعت کرے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنے درمیان سمع وطاعت کے نظام کو انتہائی حد تک مضبوط کرے۔ یہی وہ اعمال ہیں جو رحمت الٰہی (عطیہ اقتدار) کا باعث ہوں گے۔ یہی وہ مومن گروہ ہے جس کو اللہ اقتدار سونپنے کے لئے منتخب کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ اقتدار ارضی کو منصوبۂ الٰہی کے مطابق چلائیں۔ ان کے لئے اقتدار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو بے خوف وخطر خدا کی عبادت کرنے کے مواقع مل گئے۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور شے کو اپنا مرکز توجہ نہیں بناتے۔ وہ کبر اور ظلم سے اپنے آپ کو پاک رکھتے ہیں اور اقتدار کے ملے ہوئے مواقع کو تمکین دین کے لئے استعمال کرتے ہیں نہ کہ تمکین خویش کے لئے۔

خلاصہ

ایک تاجر کو آپ دیکھیں تو مختلف اوقات میں وہ مختلف سرگرمیاں کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ کہیں خاموش کہیں بولتا ہوا، کہیں بیٹھا ہوا کہیں سفر کرتا ہوا، کہیں خرچ کرتا ہوا کہیں مقدمہ لڑتا ہوا۔ تاہم اس کی بظاہر مختلف سرگرمیوں کا حاصل صرف ایک ہے: دولتِ دنیا کو پانا۔ اسی طرح ایک مومن مختلف وقتوں میں بظاہر مختلف عبادات و اعمال میں مصروف نظر آتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد ایک ہوتا ہے: دولتِ آخرت کو پانا۔

دولتِ آخرت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی پورے معنوں میں موحّد بن جائے اور ہر قسم کے شرک سے بچتا ہوا اپنے رب سے جا ملے:

عن جابرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من لقی اللہ لا یشرک بہ شیئاً دخل الجنۃ ومن لقیہ یشرک بہ شیئاً دخل النار (مسلم)

جو شخص خدا سے اس طرح ملا کہ وہ کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک نہیں کر رہا تھا وہ جنت میں داخل ہوا۔ جو اس طرح ملا کہ وہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک کر رہا تھا وہ آگ میں داخل ہوا۔

توحید اور شرک کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو شخص خدا کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرے وہ موحد ہے۔ اور جو شخص کسی بت کے سامنے عبادتی رسوم ادا کرتا ہو وہ مشرک ہے۔ یہ تو دونوں کی ظاہری علامتوں میں سے صرف ایک علامت ہے۔ توحید اور شرک دراصل طالب اور مطلوب (حج ۷۳) بننے کا معاملہ ہے۔ یہ آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ کسی شخص کا معبود وہی ہے جو اس کا حقیقی مطلوب ومقصود ہو، جس کی طرف وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ جھکا ہوا ہو۔ جس چیز کو آدمی عظمت کا مقام دے، جس پر وہ بھروسہ کرتا ہو، جس کے لئے اس کے احترام وتقدس کے جذبات وقف ہوں، جس کی یاد میں وہ غرق رہتا ہو، جس کے تصور سے اس کے نازک احساسات

بھڑکتے ہوں، جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرتا ہو اور جس سے سب زیادہ محبت کرتا ہو، جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ شامل (INVOLVE) کر دے کہ وہی اس کا سب کچھ اور وہی اس کی آخری امید بن جائے۔ کسی کو اپنی زندگی میں اس قسم کا برتر مقام دینا ہی اس کو اپنا الٰہ (معبود) بنانا ہے۔ خواہ وہ کوئی دیوتا ہو یا آدمی کا اپنا نفس۔ کوئی جان دار چیز ہو یا بے جان، کوئی زندہ ہستی ہو یا مردہ، اور وہ کئی ہوں یا صرف ایک۔

ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ آدمی صرف خدا کو اپنا الٰہ بنائے۔ وہ شرک کی تمام قسموں سے بچ کر پورے معنوں میں توحید پرست بن جائے۔ ہر قسم کی عظمت و کبریائی کا مالک صرف ایک اللہ ہے۔ جو آدمی اختیار و اقتدار میں کسی اور کو شریک کرے، وہ اسی واحد سہارے سے محروم ہو جاتا ہے جس کے سوا اس دنیا میں کوئی اور سہارا نہیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو آسمان سے گر پڑے (حج ۳۱) اور اس کے بعد ساری کائنات میں اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا کے سوا کسی کو عقیدت و اعتماد کا مرکز بنانا اس کو خدا کا برابر ٹھہرانا ہے۔ ایسا عمل اس کائنات میں "ظلم عظیم" ہے اور اس کا انجام دائمی عذاب ہے (من مات وھو یدعو للہ ندا دخل النار، بخاری) حتٰی کہ یہ بھی شرک ہے، سب سے بڑا شرک ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نمائش چاہتا ہو۔ اس کا احترام کیا جائے تو وہ خوش ہو، احترام نہ کیا جائے تو وہ بپھر اٹھے۔ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ وہ ایک ایسی برائی میں مبتلا ہے جس سے زیادہ بری چیز اس دنیا میں اور کچھ نہیں:

اخوفُ ما اخافُ علیکم الشرکُ الاصغر فسئل عنہ فقال الریاء (احمد، طبرانی، بیہقی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمھارے بارے میں مجھ کو سب سے زیادہ جس چیز کا اندیشہ ہے وہ شرک اصغر ہے۔ پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے۔ فرمایا: ریار

آدمی کی عبادت اور اس کی اسلامی سرگرمیاں اگر یہ نتیجہ پیدا کریں کہ وہ حقیقی معنوں میں اَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا (اسراء ۲) کا مصداق بن گیا ہو، ذات خداوندی اس کی تمام یادوں اور توجہات کا مرکز بن جائے، خدا کو الٰہ بنانا اس کے لئے سادہ معنوں میں صرف ایک عقیدہ کی چیز نہ ہو بلکہ وہی اس کا نفسیاتی آسرا ہو جس پر وہ جی رہا ہو ——— آدمی کی دینی زندگی اگر یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہو تو بلاشبہ وہ دین پر قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شدید اندیشہ ہے کہ وہ ابھی تک دین کو نہ پا سکا۔ دین کے نام پر وہ کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔

صریح نصوص سے ثابت ہے کہ عمل کا دار و مدار تمام تر نیت پر ہے۔ اللہ کو صرف وہی عمل مطلوب ہے جو خالصۃً اس کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ جس عمل میں کوئی اور غرض شامل ہو جائے، اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں ——— جو لوگ خدا کے دین کو تجارت بنائیں۔ جو دنیوی فائدوں اور مصلحتوں کے تحت کسی دینی عمل کو اختیار کریں۔ جو کسی دینی عمل کو بطور "کیریر" کے شروع کریں۔ جو ایسی دینی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتے ہوں جن کے ذریعہ عزت و شہرت ملتی ہے جن سے آدمی کی "امیج" میں اضافہ ہوتا ہے۔ جن سے عوامی قیادت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ شدید طور پر اس خطرہ میں مبتلا ہیں کہ ان کے اعمال قیامت میں بے وزن قرار دے دیئے جائیں۔ خواہ ان میں یہ دنیوی محرکات شعوری طور پر داخل ہوئے ہوں یا غیر شعوری طور پر۔

دینی روح کیوں نہیں

مومن کون ہے۔ قرآن کے الفاظ میں مومن وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ جب اس کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے۔ جب اس کو قرآن کی آیتیں سنائی جائیں تو اس میں اس کو اضافہ ایمان کی غذا ملنے لگے۔ جس کے لئے خدا ایک ایسی لازوال ہستی بن جائے جس پر وہ کامل بھروسہ کر سکتا ہو (انفال)۔ ایمان، خدا اور بندے کا مقام اتصال ہے۔ اس اتصال کا حقیقی طور پر وقوع میں آنا ہی ان کیفیات کے ظہور میں آنے کی یقینی ضمانت ہے۔ پاور ہاؤس اور بلب کا ملاپ اگر نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا تو خدا اور بندے کا ملاپ کیوں کر نتیجہ سے خالی رہ جائے گا۔

مگر موجودہ زمانہ میں اسلام کی ایسی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو حقیقۃً "اسلام"، کہا گیا ہے۔ ہمارے زمانہ کے عجائب میں یہ عجوبہ سب سے زیادہ حیرت ناک ہے کہ ہر طرف اسلام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر حقیقی اسلام کا کہیں وجود نہیں —— نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر "صلاۃ خشوع"، سے مسجدیں خالی ہیں۔ اسلامی مدرسوں کی تعمیرات بلند ہو رہی ہیں مگر وہ لوگ نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی زندگیوں میں بھی اسلام کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ اسلام کے نعروں سے فضائیں گونج رہی ہیں مگر اس اسلام کا وجود نہیں جو تنہائیوں میں آدمی کو بے چین کر دے۔ دوسروں کی پیٹھ پر اسلامی کوڑے لگ رہے ہیں مگر اپنی "پیٹھ" کو خدا کے حوالے کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلامی تقریروں کی بہار آرہی ہے مگر خدا کی زمین ایسے لوگوں سے خالی ہے جن کو خدا کے خوف نے بے زبان کر رکھا ہو۔ "احتساب کائنات"، کے ہنگامے ہر طرف برپا ہیں مگر احتساب نفس کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے جسم سے اس کی روح نکال دی گئی ہے۔ خود ساختہ طور پر اسلام کا ایسا ایڈیشن تیار کر لیا گیا ہے جو بظاہر اسلام ہے مگر وہی چیز اس میں موجود نہیں جو خدا ورسول کے نزدیک اسلام کا اصل مقصود تھی۔

اس کو سمجھنے کے لئے یہود کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ کیونکہ جو قومیں کتاب الٰہی کی حامل ہوں، ان کے بگاڑ کے اسباب ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ یہود کی بابت قرآن میں کہا گیا ہے کہ بعد کے دور میں ان کے اندر قساوت (سخت دلی) آگئی۔ قساوت کی حالت یہ نہیں ہے کہ دین اپنی صورت کے اعتبار سے باقی نہ رہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ دین کی صورتیں ہمیشہ مکمل طور پر باقی رہتی ہیں۔ البتہ قوم کے اندر سے ان کی روح نکل جاتی ہے۔ قساوت دراصل ذکر اور خشیت کے خاتمہ کا نام ہے (زمر ۲۲-۲۳) نہ کہ ظواہر دین کے خاتمہ کا۔

قوم کے اندر یہ بگاڑ انکار دین کے نام پر نہیں آتا، بلکہ اقرار دین کے جلو میں آتا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق شیطان ان کو ایسی ایسی تاویلات سمجھاتا ہے جس کی روشنی میں ان کو اپنا انحراف عین دین نظر آنے لگے۔ وہ اپنے اعمال

کو خوبصورت الفاظ میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے فریّن کر لیتے ہیں (انعام - ۴۳) اس تزئین کی سب سے زیادہ معروف صورت وہ ہے جس کو قرآن میں یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (مائدہ - ۱۳) فرمایا گیا ہے۔ تحریف کے معنی ہیں پھیرنا۔ کلام کو اس کے محل سے پھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ کلام کا وہ مطلب ومعنی بیان کیا جائے جو متکلم کی مراد نہ ہو۔ گویا یہود کی تزئین یہ تھی کہ وہ اپنی قساوت، بالفاظ دیگر اپنی بے روح دین داری، کو لفظی تاویلات سے ایسا خوش نما بنا لیتے تھے کہ وہی اصل دین نظر آنے لگے۔

تحریف کی صورت عام طور پر وہی ہوتی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں غلط تعبیر (MISINTERPRETATION) کہا جاتا ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ یہود کو یہ خبر دی گئی تھی کہ تم کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دی گئی ہے (بقرہ ۴۷) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے تم کو دنیا میں اپنی نمائندگی کے لئے چن لیا ہے۔ تم کو اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ تم خدائی تعلیمات کے حامل بنو اور اس کو خدا کی طرف سے دوسری اقوام تک پہنچاؤ۔ اپنے اصل مفہوم میں یہ آیت نظریاتی فضیلت کے معنی میں تھی۔ مگر یہود نے اس کو نسلی فضیلت کے معنی میں لے لیا۔ یہود کی نسل میں پیدا ہونا اس بات کے لئے کافی بن گیا کہ آدمی اس فضیلت کا مستحق ہو اور خدا کے انعامات اس کو حاصل ہوں۔ کتاب الٰہی کی اس تحریف (لفظ کو اس کے موقع ومحل سے پھیرنے) کو قرآن میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

وَقَالُوْا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (بقرہ - ۱۳۵)	وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ کہہ دو نہیں۔ بلکہ ہم پیروی کرتے ہیں دین ابراہیم کی اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھا۔

گویا ملت ابراہیمی کا فرد وہ ہے جو شرک سے اپنے کو بچائے اور سچی توحید پر قائم ہو۔ محض نسل ابراہیمی میں ہونے سے کوئی ملت ابراہیمی کا فرد نہیں بن جاتا۔ یہود کو جو "فضیلت" دی گئی وہ اپنے اصل مفہوم میں ایک سنگین ذمہ داری کو یاد دلانے والی چیز تھی۔ مگر موقع ومحل سے ہٹانے کے بعد وہ بے خوفی کا محرک بن گئی۔ اللہ کا ایک حکم جو خشیت پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ قساوت پیدا کرنے والا بن گیا ——— یہ تھی یہود کی تحریف۔ اپنی اس قسم کی تحریفوں کے ذریعہ انھوں نے دین خداوندی کو ایک بے روح ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ تم لوگ پچھلی امتوں کے راستہ پر چلو گے ——— (لتتبعن سنن من کان قبلکم) چنانچہ مسلمانوں میں آج وہ سارے انحراف دیکھے جاسکتے ہیں جو سابق اہل کتاب میں پائے جاتے تھے۔ جس طرح یہود نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اللہ کے خصوصی بندے ہیں اور وہ ضرور نجات پائیں گے۔ اسی طرح ہم نے یہ عقیدہ قائم کر لیا ہے کہ "مسلمان خیر امت ہیں اور وہ سب کے سب مرحوم ومغفور ہیں"۔ یہ بات بجائے خود صدفی صد درست ہے۔ مگر وہ مسلم امت کے کے بارے میں ہے نہ کہ کسی مسلم نسل کے بارے میں۔ امت کو نسل کے معنی میں لینا بلاشبہ یحرفون الکلم عن مواضعہ کا مصداق ہے۔ اپنے نظریاتی مفہوم میں یہ بات ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ مگر جب اس کو نسلی مفہوم میں لے لیا گیا تو وہ صرف قساوت اور بے خوفی کا محرک بن کر رہ گئی۔

حقائق کے بجائے خوش خیالیوں پر دین کی بنیاد

یہود کا نظریاتی فضیلت کو نسلی فضیلت کے معنی میں لینا یہ معنی رکھتا تھا کہ یہود کی نسل محض نسل کی حیثیت سے خدا کے نزدیک برگزیدہ ہے۔ اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر یہ ہوا کہ خدا پرستی اور یہودیت ہم معنی الفاظ بن گئے۔ ان کا خیال یہ ہوگیا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (مائدہ ۔ ۱۸) یہودی اور نصرانی پیدا ہونا ہی ہدایت یاب ہونا ہے — (بقرہ ۔ ۱۳۵) ہمارا کوئی آدمی جہنم میں نہ جائے گا اور اگر گیا بھی تو اس کا جانا صرف چند روز کے لئے ہوگا (بقرہ ۸۰)۔ قرآن نے ان کی ان خوش خیالیوں کو امانی (بقرہ ۷۸) کہا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اس قسم کے امانی خواہ یہود قائم کریں یا مسلمان قائم کریں، خدا کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا ابدی قانون تو یہ ہے کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے (نساء ۱۲۳)

امانی کے معنی ہیں بے بنیاد توقعات۔ عبد اللہ بن عباس، مجاہد اور فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ موضوع روایات اور بے سند قصے ہیں جو یہودی علماء و مشائخ نے وضع کئے اور پھر پوری قوم میں رائج ہو گئے (اکاذیب مختلقۃ سمعوھا من علمائھم فتقلبوھا علی التقلید، تفسیر نسفی) قوم یہود کے انتہائی مبالغہ آمیز فضائل، یہودیت سے تعلق رکھنے والی معمولی معمولی چیزوں کے مقدس اور متبرک ہونے کی طلسماتی داستانیں کثرت سے ان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ پوری کی پوری قوم حقیقی عمل سے غافل تھی اور انھیں موضوع روایات اور بناوٹی قصے کہانیوں پر جی رہی تھی مثلاً —— تورات کے الفاظ ایک بار بھی جس کے کان میں پڑ گئے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ اسرائیلی بزرگوں کا نام جس نے احترام و محبت سے لے لیا، اس کے جنتی ہونے میں شبہ نہیں۔ "قیامت کے دن ابراہیمؑ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوجائیں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے "

Talmud (Every man's Liberary Series)
Edited by Dr. Kohen, P. 404

ٹھیک یہی حال آج مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ کتاب اللہ کے بجائے کتاب الامانی ان کے دین کا ماخذ بنی ہوئی ہے۔ فضائل اعمال کی بے اصل روایات اور بزرگوں کے کشف و کرامت کی فرضی داستانیں بے شمار تعداد میں قوم کے اندر پھیلا دی گئی ہیں اور قوم کی قوم انھیں خوش خیالیوں کے سہارے جی رہی ہے۔

اسلام کی تاریخ میں وضع حدیث کا سلسلہ ابتداءً سیاسی محرک کے تحت شروع ہوا۔ اپنی سیاست کے حق میں دینی تصدیق حاصل کرنے کے لئے ہر فرقہ نے بے شمار حدیثیں گھڑیں اور ان کو رسول اور اصحاب رسول سے منسوب کر کے عوام میں پھیلا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل بیت کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے جو حدیثیں وضع کی گئیں، صرف ان کی تعداد تقریباً تین سو ہزار ہے۔

یہی زمانہ ہے جب کہ مسلمانوں میں "فضائل اعمال" کی حدیثیں وضع کرنے کا رجحان ابھرا۔ اس کا محرک

وہی تھا جس نے اس سے پہلے عیسائیوں میں مقدس جھوٹ (Pious Fraud) کا نظریہ پیدا کیا تھا۔ حضرت مسیح کے بعد ابتدائی صدیوں میں مسیحیت بڑی ابتر حالت میں تھی۔ اس زمانہ میں مسیحی بزرگوں نے سوچا کہ مسیحیت کی ترقی کی ایک تدبیر یہ ہے کہ اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے عجائب وغرائب باتیں گھڑی جائیں اور ان کو عوام میں پھیلایا جائے۔ اس مقصد کے لئے وضع حدیث کا ثبوت خود موجودہ مقدس انجیل میں موجود ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کے نام اپنے خط (رومیوں، ۳ : ۷) میں لکھا:

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو"

قرن اول کے بعد جب مسلمانوں میں باہمی لڑائیاں اور سیاسی جھگڑے بہت بڑھ گئے تو کچھ لوگوں نے "فضائل" کے نام پر جھوٹی حدیثیں وضع کرنی شروع کیں تاکہ لوگوں کو دینی اعمال کی طرف راغب کیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضائل جہاد نفس اور انفاق مال جیسی چیزوں کے لئے کارآمد نہ تھے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے طلسماتی فائدے بتائے جانے لگے۔ مثلاً کوئی شخص فلاں سورہ روزانہ پڑھے تو وہ خدا کے مقابلہ میں آدمی کا حصار بن جاتی ہے۔ جہنم کے فرشتے جب اس کو عذاب دینے کے لئے آتے ہیں تو وہ ان سے لڑکر ان کو بھگا دیتی ہے۔ ایک شخص نے سیکڑوں کی تعداد میں اس مضمون کی "حدیثیں" گھڑکر پھیلائیں کہ فلاں وقت "پڑھ" لو تو اتنا ثواب ہے اور فلاں وقت پڑھو تو اتنا ثواب ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم نے دین کے معاملہ میں یہ جرأت کیسے کی۔ اس نے جواب دیا:

قصدت ان اشغل الناس بالقرآن عن غیرہ — میں نے چاہا کہ لوگوں کو دوسرے مشاغل سے ہٹا کر قرآن پڑھنے میں لگا دوں۔

کسی نے حدیث گھڑی کہ کسی شخص کے ایک اولاد ہوا اور اس کا نام وہ محمد رکھے تو باپ بیٹا دونوں جنت میں جائیں گے (من ولد له مولود فسماه محمدا کان هو والولد فی الجنة) کسی نے حدیث بنائی کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اس کو جنت میں سات ہزار شہر ملیں گے۔ ہر شہر میں سات ہزار محل ہوں گے۔ ہر محل میں سات ہزار حوریں ہوں گی (من قال لا الٰہ الا اللہ اُعطی فی الجنة سبعین الف مدینة فی کل مدینة سبعون الف قصر فی کل قصر سبعون الف حوراء) کسی نے کہا کہ جس شخص نے ۱۵ شعبان کو ۱۲ رکعتیں پڑھیں، اس طرح کہ ہر رکعت میں ۳۰ بار قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ پڑھا تو وہ نہ صرف خود جنت میں جائے گا بلکہ اپنے خاندان کے دس ایسے آدمیوں کو بھی خدا سے کہہ کر جنت میں لے جائے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی (من صلی لیلة النصف من شعبان ثنتی عشرة رکعة یقرأ فی کل رکعة ثلاثین مرة قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ شفع فی عشرة من اهل بیته قد استوجبوا النار)

سخاوی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: القول البدیع فی الصلوٰة علی حبیب الشفیع۔ یہ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے بارے میں ہے۔ پوری کتاب عجائب وغرائب قصوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصہ،

ے وسیکون فی آخر امتی اناس یحدثونکم مالم تسمعوا انتم ولا آباؤکم فایاکم وایاھم (رواہ مسلم عن ابی ھریرہ)

ان کے بیان کے مطابق، یہ ہے :

"ایک عورت حسن بصری کے پاس آئی اور عرض کیا کہ میری لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ میری تمنا ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں۔ حسن بصری نے کہا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر چار رکعت نفل نماز پڑھ اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ پڑھ اور اس کے بعد لیٹ جا۔ اور سونے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتی رہ۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے لڑکی کو خواب میں دیکھا کہ بے حد سخت عذاب میں ہے۔ تارکول کا لباس جسم پر ہے۔ دونوں ہاتھ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں آگ کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ عورت صبح کو اٹھ کر پھر حسن بصری کے پاس گئی۔ اور جو کچھ دیکھا تھا، ان کو بتایا۔

اگلے دن حسن بصری نے خواب میں دیکھا کہ جنت کا ایک باغ ہے۔ اس میں ایک بہت اونچا تخت ہے۔ اس میں ایک حسین وجمیل لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر ایک نور کا تاج ہے۔ وہ کہنے لگی حسن! تم نے مجھ کو پہچانا، کہا نہیں۔ بولی، میں وہی لڑکی ہوں جس کی ماں تم سے ملی تھی۔ حسن بصری نے کہا تیری ماں نے تو تیرا حال اس کے برعکس بتایا تھا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی نے جواب دیا، میری حالت وہی تھی جو ماں نے بیان کی۔ میں نے پوچھا، پھر یہ مرتبہ کیسے حاصل ہوگیا۔ اس نے کہا، ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے جو میری ماں نے آپ سے بیان کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا۔ انھوں نے ایک دفعہ درود پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا۔ ان کا درود اللہ کے یہاں ایسا قبول ہوا کہ اس کی برکت سے ہم سب اس عذاب سے آزاد کر دیئے گئے اور ہم کو وہ رتبہ نصیب ہوا، جو تم دیکھ رہے ہو"

اس قسم کی بے شمار روایات گھڑ کر ساری امت میں پھیلا دی گئیں۔ اب اگر کچھ لوگ یہ کریں کہ ان "حدیثوں" کو جمع کر کے فضائل اعمال کا صحیفہ مرتب کریں اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو دین دار بنانا شروع کریں تو ایک عجیب وغریب قسم کا دین وجود میں آئے گا۔ لوگ بظاہر ذکر اور درود اور تلاوت اور نمازیں مشغول ہوں گے مگر یہ مشاغل ان کے سینہ میں خوف خدا سے کانپنے والا قلب نہیں بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایسا قلب وجود میں آئے گا جو اپنے کو خدا کی پکڑ سے بالکل مامون سمجھے گا۔ معمولی معمولی باتوں سے جب ہر صبح وشام جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہوں تو آخرت کے خوف سے کانپنے کی کیا ضرورت۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی "امانی" نے اللہ کے دین کو عملاً مذاق بنا کر رکھ دیا۔ وہ دین جس کا مقصد بندوں میں خشیت اور اندیشہ کی کیفیت پیدا کرنا تھا۔ وہ صرف قساوت میں اضافہ کا سبب بن گیا۔

خالق کے بجائے مخلوق کا سہارا پکڑنا

قرآن کی ایک آیت ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (مائدہ ۳۵)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کا وسیلہ تلاش کرو۔

اس آیت میں "وسیلہ" کے لفظ کو کچھ لوگوں نے اس مفہوم میں لے لیا جس میں وہ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح دنیوی حکمرانوں کے یہاں ذریعے اور وسیلے ہوتے ہیں، اسی طرح خدا کے یہاں بھی وسیلے ہیں۔ یہ وسیلے انبیاء اور اولیاء ہیں۔ ان وسیلوں کو پکڑلو، ساری خدائی تمھارے ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ عقیدہ چونکہ عوامی مزاج سے قریب تھا، اس کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب یہ حال ہے کہ خدا کے بالمقابل بے شمار زندہ اور مردہ "خدا" پیدا ہو گئے ہیں جن کا دامن لوگوں نے تھام رکھا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ خدائی وسیلے دنیا سے لے کر آخرت تک ان کے سارے کام بناتے چلے جائیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے عقیدہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ عربی زبان میں "وسیلہ" کا مفہوم سرے سے نہیں آتا۔ لفظ وسیلہ مذکورہ آیت میں، اردو (ذریعہ) کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ اپنے عربی مفہوم (قرب) کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کی فرماں برداری اور اس کے پسندیدہ عمل کے ذریعہ اس کی قربت اور نزدیکی حاصل کرو (تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بمایرضیہ، قتادہ) ابن جریر طبری نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: اطلبوا القربۃ الیہ بالعمل بمایرضیہ (اللہ کی نزدیکی اس عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرو جس عمل کو وہ پسند کرتا ہے)

کسی بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے قریب پہنچ سکے۔ اس آیت میں یہ راز کھولا گیا تھا کہ اس مطلوب کو پانا ہر بندہ کے لئے ممکن ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے کو اپنے رب کے پسندیدہ راستہ پر لگا دے۔ مگر غلط تعبیر نے آدمی کو اس خزانہ سے محروم کر دیا جو اس کے اندر رکھا گیا تھا۔ جس آیت میں خدا کو پانے کا راز بتایا گیا تھا، اس نے لوگوں کو صرف قبروں اور آستانوں تک پہنچانے کا کام انجام دیا۔ وہ آیت جس میں خوف خدا کی غذا تھی، ایک خود ساختہ تشریح کے ذریعہ اس میں بے خوفی کا سامان تلاش کر لیا گیا۔ جو قرآن اللہ کی پرستش کی تعلیم دینے آیا تھا، اس سے لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کا حکم نکال لیا۔ اس عقیدہ کے تحت جو مذہب بنا، قدرتی طور پر اس میں قبروں کی پرستش اور زندہ "بزرگوں" کی عقیدت نے خوب ترقی کی "اولیاءاللہ" کی فضیلت وکرامت کی بے شمار فرضی کہانیاں گھڑی گئیں۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ یہ حضرات بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں۔ بزرگوں کی کراماتی داستانوں کی مقدس طلسم ہوش ربا تیار ہو گئی ہے اور ساری قوم اس کی تلاوت میں مشغول ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے خوف ومحبت، گناہوں سے بچنے کی تڑپ، آخرت کی بازپرس سے بچنے کا فکر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ "وسیلہ" حاصل کر لینے کے بعد ان چیزوں کے لئے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس قسم کے تمام عقائد دراصل خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ (Underestimation) ہیں۔ جو لوگ زندہ یا مردہ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، انھیں خبر نہیں کہ یہ ہستیاں ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں (حج ۷۳) جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے "اکابر" کا دامن تھام کر جنت میں پہنچ جائیں گے، ان کو خدا کے قانون جزا وسزا کی سنگینی کا اندازہ نہیں (انعام ۹۱) جو لوگ آخرت کے دن کو اپنے "بڑوں" کی جلوہ گاہ سمجھتے ہیں، ان کو خبر نہیں کہ آخرت جب آئے گی

تو عالم یہ ہوگا کہ سارا آسمان، خدا کے ایک ہاتھ میں لپٹا ہوا ہوگا ۔ اور زمین کو خدا اپنی مٹھی میں لے کر فرمائے گا :
انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این الجبارون این المتکبرون این ملوک الارض (میں ہوں بادشاہ میں ہوں جبار، میں ہوں کبریائی والا، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں جبار کہاں ہیں متکبر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے یہ الفاظ دہرائے تو راوی کا بیان ہے کہ :

فرجفت برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المنبر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ
حتی قلنا لیخرنّ بہ (ابن کثیر)	ہم نے کہا کہ آپ منبر سے گر پڑیں گے

دوسری طرف ہم نے ایسے ایسے "بزرگ" پیدا کر رکھے ہیں جو میدان حشر میں عین خدا کے سامنے ہماری طرف سے وکیل بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک کسی کو جنت میں جانے نہ دیں گے جب تک اپنے تمام معتقدین کو جنت میں نہ بھیج لیں۔

معانی کے بجائے صورتوں کو مطلوب سمجھ لینا

۱۔ قرآن کی سورہ نمبر ۵۴ میں کہا گیا ہے : وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ اس کا ترجمہ کچھ لوگوں نے ان الفاظ میں کیا: "ہم نے سہل کر دیا قرآن کو حفظ کرنے کے لئے، پھر کوئی ہے حفظ کرنے والا"۔ اس ترجمہ کے مطابق سمجھ لیا گیا کہ اس آیت میں قرآن کو رٹ کر یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے ۔ اب بے شمار لوگ قرآن کو رٹنے میں مشغول ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس آیت کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں ۔ قرآن کی سورتوں کو یاد کرنا بجائے خود مومن کی ایک ضرورت ہے ۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ آیت کا اس قسم کے عمل سے کوئی تعلق نہیں ۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے آیت کا ترجمہ کیا ہے : "ہم نے آسان کیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا"۔ مطلب یہ کہ قرآن میں حقائق دینیہ کو مدلل اور قابل فہم انسانی زبان میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ پھر کوئی ہے جو اس پر دھیان دے اور اس سے اپنے لئے نصیحت اور اصلاح کا سامان حاصل کرے ۔ اس آیت میں کتاب الٰہی پر غور وفکر کے لئے اکسایا گیا ہے۔ قرآن کے اندر آدمی کے قلب و دماغ کے لئے جو ربانی غذا رکھی گئی ہے، اس میں سے اپنا حصہ لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ مگر ایک معنوی حقیقت کو لفظی تکرار کے معنیٰ میں لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آیت آدمی کے لئے اس قسم کی غذا کا ماخذ نہ رہی۔ وہ الفاظ کو زبانی طور پر رٹنے کے ایک بے کیف عمل کے ہم معنی بن کر رہ گئی ۔

۲۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے :

مَن قال لا إلٰه الا اللّٰہ دخل الجنۃ	جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں جائے گا ۔

اس قسم کی روایات میں لفظ "قول" کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس کلمہ اسلام کا تلفظ ہی جنت میں داخلہ کے لئے کافی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ آدمی کا ایک قول اس کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے ۔ مگر قول سے مراد ایک حقیقی انسان کا قول ہے نہ کہ کسی کمپیوٹر کا قول ۔ ایک حقیقی انسان کا قول اس کی پوری ہستی سے ٹپکتا ہے نہ کہ محض حرکت لسانی سے وجود میں آتا ہے ۔ ایک بندہ جب فی الواقع یہ قول دیتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں"، تو وہ محض کچھ رسمی

الفاظ نہیں ہوتا ۔ وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے خدا کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کو پالیا ہے ۔ یہ بول اس کی اندرونی ہستی کا لفظی اظہار ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقی ہستی سے الگ محض حرکت لسانی کی سطح پر چند کلمات کا تلفظ۔

" قول " کی یہ حقیقت قرآن و حدیث سے بخوبی واضح ہے ۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ میں ایک گروہ کا ذکر ہے جس نے کہا تھا کہ " اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے " اس گروہ کے متعلق قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کے اس " قول " کی وجہ سے اللہ نے ان کو جنت دے دی (فاثابھم اللہ بما قالوا جنات ۔ ۸۵)

مگر قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول محض حرکت لسان نہ تھا بلکہ اعلیٰ نفسیاتی سطح پر عرفان حق کا معاملہ تھا۔ یہ ان کی پوری ہستی تھی جو لفظوں کی صورت میں ابل پڑی تھی ۔ اس قسم کا واقعہ اگرچہ بظاہر ایک قولی اقرار ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ کائنات کا سنجیدہ ترین معاملہ ہوتا ہے جس کے ایک سرے پر عاجز اور حقیر بندہ ہوتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر وہ قادر مطلق ہستی ہوتی ہے جس کی تجلیات کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ یہ صورت حال اس اقرار کو بے حد سنگین واقعہ بنا دیتی ہے ۔ اپنی ساری لطافت کے باوجود جب یہ " قول " عالم واقعہ میں ظہور میں آتا ہے تو انسانی شخصیت کے لئے وہ اتنا سنگین ہوتا ہے کہ آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا سیلاب پھٹ پڑتا ہے (تَرٰىٓ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ)

وہ اقرار ایمان جو آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے ، قرآن و حدیث کے مطابق ، آدمی کی پوری ہستی کا نذرانہ ہے ۔ مگر اس سے یہ مفہوم نکال لیا گیا کہ زبان سے کلمہ اسلام کا تلفظ کرو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ ۔

۳ ۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (احزاب) اے ایمان لانے والو اللہ کو یاد کرو بہت زیادہ

اس آیت میں " ذکر کثیر " کے لفظ کو کچھ لوگوں نے گنتی کے معنوں میں لے لیا ۔ وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کتنا زیادہ ذکر ہو تو وہ کثیر کہا جائے گا ۔ کچھ لوگوں نے تین سو کا نصاب بنایا ۔ کسی نے پچاس ہزار کا ، کسی نے ایک لاکھ کا ۔ اس طرح کے عددی نصاب کا یہ بھی تقاضا تھا کہ ذکر کے لئے کوئی متعین لفظ یا فقرہ ہو ۔ کیوں کہ الفاظ کے تعین کی صورت ہی میں اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقررہ نصاب کا عدد پورا ہوا یا نہیں ۔

مگر اس طرح کے کسی عمل کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہاں اللہ کے ذکر سے مراد اللہ کی یاد ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو بہت زیادہ یاد کرو ۔ خدا کا اور خدا کی باتوں کا تصور اپنے اوپر اتنا زیادہ طاری کرو کہ وہ ہر وقت تم کو یاد آتا رہے ۔ یہ ذکر در اصل گہرے تعلق باللہ کا نتیجہ ہے ۔ وہ مصنوعی طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ فطری طور پر اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ آدمی کا اندرون خدا کے خوف و محبت سے بھر گیا ہو ۔ بندہ نفسیاتی طور پر اپنے رب سے جڑ گیا ہو ۔ ذکرِ حقیقی کی پہچان یہ ہے کہ تنہائیوں میں بندہ اپنے خدا کو یاد کرے اور شدت یاد سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں (ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ) خدائے ذوالجلال کا ذکر آنسوؤں کے قطرات پر ہوتا ہے نہ کہ تسبیح کے دانوں پر ۔

قرآن کا ایک حکم جس میں روح کو تڑپانے اور قلب کو پگھلانے کا سامان تھا ، اس کو ورزشِ لسان کے ہم معنی سمجھ لیا گیا

جو قلب کو صرف سخت کرنے والا ہے نہ کہ وہ لطافتِ احساس کے اس مقام کو پہنچائے جس کو ذکر کہا گیا ہے۔

دعا کے بجائے عملیات

دعا (اللہ سے مانگنا) اہم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے الدعاءمخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) الدعاء ھی العبادۃ (دعا ہی عبادت ہے)۔ مگر یہود کے اثر سے مسلمانوں میں دعا کے بجائے عملیات کا رواج چل پڑا۔

دونوں کا فرق سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرتا ہے۔ دوسرا شخص اسی ملازمت کے لئے یہ کرتا ہے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کرکے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ یقین کرتا ہے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی ——— پہلی مثال درخواست کی مثال ہے۔ دوسری مثال کرتب یا عملیات کی مثال۔

خدا سے مانگنے کا طریقہ صرف دعا کا طریقہ ہے۔ دعا یا درخواست وہ چیز ہے جو بندے کو براہ راست خدا سے ملاتی ہے۔ وہ اس کے اندر عبودیت کے جذبات ابھارتی ہے۔ وہ اس کو دین کی حقیقت اعلیٰ سے آشنا کرتی ہے۔ دعا میں بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے۔ وہ اس کو پکارتا ہے۔ اس سے روتا گڑگڑاتا ہے۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر ان ربانی کیفیات کا تجربہ کرتا ہے جو کسی اور طرح آدمی کو نہیں مل سکتیں۔ اللہ سے مانگنے کی کیفیت ابھرنا سب سے بڑا دینی حاصل ہے۔ مگر عملیاتی کرتب دکھانا اتنا ہی بے معنی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

عملیات کی دو قسمیں ہیں ——— عبادتی عملیات اور ساحرانہ عملیات۔ عبادتی عملیات سے مراد وہ طریقے ہیں جن کے متعلق یقین کر لیا گیا ہے کہ ان کو دہرا لینے سے آخرت کی نعمتوں کے دروازے آدمی کے اوپر کھل جاتے ہیں۔ ساحرانہ عملیات وہ ہیں جو دنیا کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے گھڑے گئے ہیں۔

راقم الحروف کی ملاقات ایک عالم سے ہوئی۔ ملاقات کے دوران انھوں نے ایک کتاب کا ذکر کیا جس میں محدثین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا گیا تھا: "انھوں نے زبردست محنت کرکے تمام حدیثیں جمع کیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا"۔ موصوف نے انتہائی خفگی کے ساتھ اس فقرہ کا ذکر کیا۔ میں حیران تھا کہ اس فقرہ میں آخر وہ کون سی خرابی ہے جس پر وہ اتنے شدید ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر وہ بولے "آپ کیسے دعوی کر سکتے ہیں کہ محدثین نے تمام کی تمام حدیثیں جمع کر ڈالی ہیں"۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مثال کے طور پر صلاۃ معکوس کی روایت محدثین کو نہیں ملی۔ جب کہ فلاں بزرگ نے اس کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

صلاۃ معکوس کا مطلب ہے الٹی نماز۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بستی کے باہر کوئی ایسا اندھا کنواں تلاش کیا جائے جس کے اوپر درخت اگا ہوا ہو۔ آدمی درخت سے رسی لگا کر اپنا پاؤں اس میں باندھ لے اور کنوئیں میں سر نیچے پاؤں اوپر کرکے لٹک جائے اور اسی حالت میں نماز ادا کرے۔ بتایا جاتا ہے کہ جو شخص ایک بار بھی یہ نماز پڑھ لے وہ دونوں

جہان کی سعادتیں سمیٹ لینا ہے۔ میں نے کہا کہ بزرگ موصوف نے اس روایت کے ساتھ اس کی سند نقل نہیں کی ہے۔ اس لئے کیوں کر اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس پر موصوف بگڑ گئے اور بات ختم ہو گئی۔

بعد کے دور میں، خصوصاً متصوفانہ حلقوں میں مسلمانوں کے درمیان بہت سے عملیاتی طریقے رائج ہوئے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ ان پر اسرار شکلوں کو ان کے ظاہری آداب کے ساتھ دہرا دینے سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔ اس قسم کے عملیات نے خدا کے دین کو اس سطح پر پہنچا دیا جہاں روایتی کہانی کا طلسماتی خزانہ تھا۔ وہ "سم سم" کہنے سے کھلتا تھا۔ دوسرا کوئی لفظ مثلاً جم جم یا دم دم کہنے سے نہیں کھلتا تھا۔ اسی طرح گویا اسلام کے بھی کچھ منتر یا کرتب تھے۔ آدمی نے اگر ان کو ظاہری صحت کے ساتھ دہرا دیا تو اس کے بعد نجات اور سعادت کے تمام دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے، ٹھیک ویسے ہی جیسے "سم سم" کہنے سے طلسماتی خزانہ کے دروازہ کا کھل جانا۔ مگر یہ وہ اسلام ہے جو دوسری قوموں کے اثر سے لیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی عبادت انابت الی اللہ (زمر ۱۷) کا نام ہے۔ اس کی حقیقت خدا کے آگے دل کا جھکاؤ ہے نہ کہ اعضاء و جوارح کے ذریعہ کوئی کرتب دکھانا۔

قرآن میں ساحرانہ عملیات کو کفر کہا گیا تھا (بقرہ ۱۰۲) مگر ایک خوبصورت تاویل کر کے اس کو اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی مذکورہ آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> "سحر میں اگر کلمات کفریہ ہوں مثل استعانت بہ شیاطین یا کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے۔ اور اگر کلمات مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذن شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو فسق اور معصیت ہے۔ اور اگر ضرر نہ پہنچایا جاوے نہ اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جاوے تو اس کو عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے۔" (تفسیر بیان القرآن)

اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جو فلاح آخرت کا راستہ دکھانے کے لئے آیا تھا، اس کو فلاح دنیا کا موضوع بنا لیا گیا۔ ہر قسم کے دنیوی مقاصد میں قرآن کو استعمال کیا جانے لگا۔ اسرائیلی روایات کے تحت عملیات کا جو علم سینہ بہ سینہ چلا آ رہا تھا، اس کے علاوہ خود "کتاب محفوظ" بھی طرح طرح کے عملیاتی نسخوں کا قیمتی ماخذ بن گئی۔

"اعمال قرآنی" کے نام پر مسلمانوں نے جو سفلی طریقے رائج کئے ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآنی سورتوں کے "خواص" کہا جاتا ہے۔ یہ خواص سب کے سب دنیوی نوعیت کے ہیں۔ حتیٰ کہ یہود کی تقلید میں ہر سورہ کے اعداد مقرر کئے گئے ہیں اور ان کے نقوش بنا کر حاجات دنیا میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بے شمار لوگوں نے تعویذ گنڈوں کی دکانیں کھول لی ہیں اور قرآن کو ایک تجارت بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ سورہ مریم کے اعداد دو لاکھ ننانوے ہزار چھ سو چالیس ہیں۔ اس کے اعداد کا نقش حسب ذیل ہے۔

۹۶۵۵۱	۹۶۹۴۴	۹۶۵۴۹
۹۶۵۴۹	۹۶۵۴۸	۹۶۵۵۳
۹۶۵۴۷	۹۶۵۵۲	۹۶۵۴۵

ایک بہت بڑے بزرگ لکھتے ہیں ۔ "اگر باغ ویران شدہ میں درختوں کے ساتھ سورہ مریم کا یہ نقش باندھ دیں تو باغ لہلہائے شگفتہ اور ثمر سے بھرپور ہو جائے" ان اعمال کے نتیجہ میں نہ صرف قرآن ایک سستا دنیوی نسخہ بن کر رہ گیا بلکہ وہ قوم کے اندر توہمات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ کیوں کہ اس قسم کے نقش تعویذ سے کبھی کوئی ویران باغ پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا چمن نہیں بن سکتا۔ مزید یہ کہ جس قوم میں اس قسم کی عملیات کا رواج ہو جائے اس کے اندر کبھی صحیح معنوں میں خدا پرستانہ مزاج پیدا نہیں ہو سکتا۔ آدمی جب دعا کرتا ہے تو وہ اللہ سے مانگتا ہے اس کی توجہ تمام تر اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ عملیات کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کی توجہ اس عمل کے پُراسرار خواص پر لگی رہتی ہے۔ دعا میں آدمی اللہ سے جڑتا ہے اور عملیات میں خود عملیات سے یا ان پُراسرار اسباب سے جن کے متعلق اس کا گمان ہوتا ہے کہ وہ عملیات کے پیچھے کام کر رہے ہیں —— صلاۃ التسبیح اور ختم خواجگان سے لے کر نقش تعویذ تک جو بے شمار عملیات مسلمانوں میں رائج ہوئے، انھوں نے دین خداوندی کو دین یہودیت بنا کر رکھ دیا ہے۔

ذاتی حکم کو خارج کی طرف موڑ دینا

قرآن میں اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے: وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (سیدھی ترازو تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو) اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باہمی تعلقات میں عدل پر قائم رہیں۔ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے نہ کسی کا حق دبائے۔ ترازو کی طرح ہر ایک سے انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ یہ آیت آدمی کو ابھارتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو عدل و انصاف کی راہ پر ڈال دے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں آیت کا یہ مطلب بیٹھ جائے کہ "لوگوں کے ترازو کو سیدھا کرو"، تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ اب اس آیت میں اس کی اپنی ذات کے لئے کوئی غذا نہ ہوگی۔ وہ اس حکم کا مطلب یہ سمجھے گا کہ دوسروں کے اوپر "داروغۂ انصاف" بن کر کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنی اصلاح کی فکر کرنے کے بجائے دوسروں سے لڑنا شروع کر دے گا۔ خواہ اس لڑائی کا نتیجہ عملاً شدید تر بے انصافی کو لانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔

یہی صورت ان لوگوں کے ساتھ پیش آئی ہے جو دین کو "اسٹیٹ" کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن کی وجہ سے دین کو ایک ریاستی نظام کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ دین ان کے لئے حکومتی امور کا موضوع ہے نہ کہ حقیقۃً ذاتی اصلاح کا موضوع۔ اپنی دینی ذمہ داری کا تصور ان کے ذہن میں یہ ہے کہ دین کو ایک ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر جاری و نافذ کیا جائے۔ چوں کہ سارے قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے اس قسم کا دینی مشن اخذ ہوتا ہو۔ اس لئے ان کے ذہن نے نہایت آسان سبیل یہ نکالی کہ انفرادی احکام کو اجتماعیات کی طرف موڑ دیا۔ "ترازو صحیح تولو"، کو اس مفہوم میں لے لیا کہ "لوگوں کے ترازو صحیح کرو"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن احکام میں فرد کے لئے اپنی ذات کی غذا رکھی گئی تھی، وہ دوسروں کے خلاف تقریر اور ایجی ٹیشن کی خوراک لینے کا ماخذ بن کر رہ گئی۔

۱۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے —— اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (شوریٰ ۱۳) اس کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی کو پوری طرح دین کے سانچے میں ڈھال لو۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرو اور بندوں کے جو حقوق تمھارے اوپر آتے ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک پورا کرو۔ مگر جن لوگوں کے ذہن میں دین کا مذکورہ "انقلابی" مفہوم بیٹھا ہوا ہے، ان کے لئے یہ آیت اس قسم کی ذاتی غذا کا سبب نہ بن سکی۔ انھوں نے اپنے ذہنی شاکلہ کے مطابق اس کا مطلب یہ نکال لیا کہ ——— دین کو بحیثیت ایک ریاستی نظام کے زمین پر نافذ کرو۔ وہ آیت جو آدمی کے اپنے اندرون کو جھنجوڑنے والی تھی، وہ صرف خارجی ہنگامہ آرائی کا عنوان بن کر رہ گئی۔ اس آیت کو پڑھ کر مذکورہ ذہن نے فوراً اس قسم کی تقریر شروع کر دی:

"قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا، اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے۔ بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصہ پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تقریر صرف اس لئے وجود میں آئی کہ وہ حکم جس کا مطلب تھا "دین پر قائم ہو"، اس کو اس معنے میں لے لیا گیا کہ ——— "دین کو دوسروں کے اوپر قائم کرو۔"

۲۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (نساء ۱۳۵) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان لانے والو، تم میں سے ہر شخص انصاف کو اختیار کرے، عدل کی روش پر خوب خوب قائم ہو جائے۔ اس حکم کا نشانہ آدمی کی اپنی ذات ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی اصلاح کے بارے میں پوری طرح متحرک کرنا چاہتی ہے۔ مگر مذکورہ ذہن کے سامنے یہ آیت آئی تو اس نے اس کا ترجمہ کیا: "اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار بنو۔" اور اس کے بعد اس نے ان الفاظ میں اس کی تفسیر شروع کر دی:

"یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہئے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل وراستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لئے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔"

اس تقریر کو پڑھنے والا اس آیت سے جو اثر لے گا وہ یہ کہ آدمی انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھے اور لوگوں کے اوپر انصاف کا نظام قائم کرے۔ بالفاظ دیگر یہ آیت، مذکورہ تشریح کے خانہ میں خارجی مشن کا پیغام بن جاتی ہے۔ حالاں کہ آیت کا اس قسم کے خارجی مشن سے کوئی تعلق نہیں۔ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: "اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو"۔ یہ آیت ہر بندۂ مومن کو ذاتی طور پر خطاب کر رہی ہے اور اس کو خدا کا یہ پیغام پہنچا رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کے معاملات میں انصاف کی روش پر قائم رہنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرو۔ اپنے آپ کو انتہائی

حد تک انصاف کا عامل بنا دے ـــــــ آیت کے اگلے الفاظ مزید تاکید کر رہے ہیں کہ جب کسی سے اختلاف ہو جائے اس وقت بھی انصاف کی روش کو نہ چھوڑو۔ ایک حکم الٰہی جس میں ہدایت کی ذاتی غذا تھی، زاویہ نگاہ بدل جانے کی وجہ سے وہ خارجی دنیا کے خلاف تقریری کمال دکھلانے کا عنوان بن گیا

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (بقرہ ـ ۲۰۸) یہ آیت بھی اہل ایمان کو انفرادی طور پر خطاب کر رہی ہے اور ہر شخص سے کہہ رہی ہے کہ تم اپنی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ لو، اپنے عقائد اور اپنے اخلاق و معاملات میں اسلامی تعلیمات کو پوری طرح اختیار کرلو۔ اس میں ہر بندۂ مومن کے لئے ذاتی ہدایت کا سامان ہے۔ اس آیت میں ہر شخص اپنے رب کو اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے پاتا ہے۔ مگر مذکورہ ذہنی مزاج پیدا ہو جائے تو آیت کو پڑھتے ہی آپ کا ذہن خارجی دنیا کی طرف مڑ جائے گا۔ آپ اس کو تلاوت کرکے حسب ذیل تقریر شروع کر دیں گے:

"لوگو، قرآن کی یہ آیت ہمیں ایک عظیم انقلابی پروگرام دے رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اٹھیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی حکومت کا نظام قائم کر دیں۔ خاندان سے لے کر پارلیمنٹ ہاؤس اور بین اقوامی زندگی تک کوئی گوشہ حکومت خداوندی سے باہر نہ رہے"۔ بظاہر یہ تقریر بڑی شاندار معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ ایک ایسے تقریری ریکارڈ کی مانند ہے جو خالی میدان میں بجایا جا رہا ہو، جس کا نہ کوئی سننے والا ہو اور نہ اثر لینے والا۔

۴۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ـ ۶۷)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: "حکم تو بس اللہ ہی کا ہے"۔ مطلب یہ کہ اس عالم میں طاقت و اقتدار کے تمام سرے خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کچھ بھی سوچے اور کتنی ہی تدبیریں کرے۔ مگر وہی ہوگا جس کی اجازت خدا دے گا۔ خدا کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ آیت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں کس قدر عاجز ہے۔ وہ یہ سبق دیتی ہے کہ انسان گھمنڈ کی روش ترک کر دے۔ وہ مکمل طور پر خدا پر بھروسہ کرے۔ اپنے معاملات میں اسی سے مدد کی درخواست کرے۔

مگر مذکورہ ذہن کے لئے آیت میں اس قسم کی ذاتی غذا نہیں ہوگی۔ آیت میں ایک ایسے اقتدار کا ذکر ہے جو بالفعل قائم ہے۔ مگر وہ اس سے ایک ایسا اقتدار نکال لے گا جو اسے اپنی انقلابی جدوجہد کے ذریعہ قائم کرنا ہے۔ وہ بس "حکم" کا لفظ لے گا اور پھر اپنی تقریر شروع کر دے گا:

"اقتدار صرف خدا کا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ زمین پر اپنا قانون جاری کرے۔ حکومتی اقتدار تمام تر خدا کا ہونا چاہئے۔ مومن کا مشن یہ ہے کہ غیر خدائی سیاست کی جتنی قسمیں زمین پر قائم ہیں ان کو ختم کر دے اور زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کا اقتدار اعلیٰ قائم کر دے"۔ ـــــ آیت کا مدعا یہ تھا کہ خدا کی برتری یاد دلا کر انسان کو اس کا عبادت گزار بننے پر اکسایا جائے۔ مگر فوق اللفظی حکم کو سیاسی حکم کے معنی میں لے کر اس سے سیاسی مشن نکال لیا گیا۔

۵۔ اسی طرح مثال کے طور پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ کو لیجئے۔

الٰہ کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی طرف اپنی حاجتوں کے لئے رجوع کیا جائے، اور عبادت کے معنی ہیں پرستش۔ یہ مفہوم انسان کے اندر عجز و افتقار کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس میں اس کو یہ سبق ملتا ہے کہ بنانے بگاڑنے کا سارا اختیار صرف خدا کے پاس ہے۔ مجھے اپنی فلاح و نجات کے لئے اسی کی طرف دوڑنا چاہئے اور اسی کے آگے اپنے کو ڈال دینا چاہئے۔ لیکن مذکورہ ذہن اس آیت میں الٰہ کے معنی حاکم لے گا اور عبادت کو سیاسی اطاعت کے ہم معنی سمجھنے لگے گا۔ اس آیت کو پڑھ کر اس کے اندر جو جذبہ ابھرے گا وہ یہ کہ خدا ہی سیاسی حکمراں ہے اور اسی کی سیاسی اطاعت زمین پر قائم ہونی چاہئے۔ بظاہر یہ ایک اچھی اور صحیح بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس تشریح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت سے عبودیت کی جو غذا ملنی چاہئے، وہ آدمی کو نہیں ملے گی۔ اس کو پڑھ کر اس کے اندر سیاست آرائی کا ذہن ابھرے گا۔ وہ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کو کام سمجھے گا۔ اس آیت سے اس کو سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کی غذا ملے گی نہ کہ اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دینے کی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کے مذکورہ تصور کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کے ذہن میں حکم الٰہی کا نشانہ بدل جائے گا۔ اب اپنی ذات کے بجائے خارج کی دنیا وہ جگہ ہوگی جہاں وہ حکم الٰہی کی تعمیل کرنا چاہے گا۔ وہ اپنی زندگی کو بدلنے کے بجائے "نظام" کو بدلنے پر اپنی ساری نظریں جما دے گا۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے غافل ہوں گے۔ مگر مسائل عالم کے موضوع پر گفتگو کرنے سے ان کی زبان کبھی نہیں تھکے گی۔ نماز کی "اقامت" سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ ہوگی مگر وہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نعرہ بلند کریں گے۔ ان کا گھر جہاں وہ آج بھی قوّام کی حیثیت رکھتے ہیں، اس میں اہل باطل کی روش کی تقلید ہو رہی ہوگی۔ مگر ملک کے اندر وہ قوام بننے کا نعرہ لگائیں گے تاکہ ملک سے باطل نظام کو ہٹایا جا سکے۔ ان کا سینہ خدا کی یاد سے خالی ہوگا مگر وہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر قبضہ کرنے کی تحریک چلائیں گے تاکہ دنیا بھر میں خدا پرستی کا چرچا کیا جا سکے۔ "جزء دین" پر عمل کرنے میں وہ کوتاہ ہوں گے مگر "کل دین" کے نفاذ کے لئے وہ بین اقوامی کانفرنس کا انعقاد کریں گے۔ خواہ اس کا انعقاد عملاً وقت اور مال کے ضیاع کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

دینی اتحاد کے بجائے دینی اختلاف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی تھی کہ سابق اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے، تم لوگ ۷۳ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔ یہ تنبیہ آج واقعہ بن چکی ہے۔ مسلمانوں میں مختلف ناموں سے بے شمار فرقے اور جماعتیں وجود میں آگئی ہیں۔ ہر ایک نے اپنا علیحدہ تنظیمی ڈھانچہ بنا رکھا ہے۔ ہر ایک کا اپنا لٹریچر ہے۔ حتیٰ کہ اپنی اپنی شرحیں اور تفسیریں تیار کر کے ہر ایک نے اپنا قرآن و حدیث بھی الگ کر لیا ہے۔ یہ صورت حکم الٰہی کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ نے دینی اتحاد کی تاکید فرمائی تھی (آل عمران ۱۰۳) ہم نے اس کو دینی اختلاف میں تبدیل کر لیا۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ اللہ کی رحمتیں اور نصرتیں ہمارے اوپر نازل ہوں۔

دینی اختلاف پیدا ہونے کی وجہ ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ دین کے کسی اضافی جزء کو اعتقاداً یا عملاً وہ اہمیت دینا جو دین کے حقیقی اور اساسی جزء کو ہونی چاہئے۔ دین کے حقیقی حصہ کو قرآن میں الدین (شوریٰ ۱۳) اور اس کے اضافی اجزاء کو شرعۃ اور منہاج (مائدہ ۴۸) کہا گیا ہے۔ الدین سے مراد وہ ابدی تعلیمات ہیں جو تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر دی جاتی رہیں۔ مثلاً توحید، اخلاص وغیرہ۔ شرعۃ سے مراد قانونی تفصیلات اور منہاج سے مراد پیغمبر کی سنت یا تعامل ہے[۵]۔ یہ تفصیلات اور تعامل وقتی حالات کے تابع ہوتے ہیں، اس لئے ان میں مختلف انبیاء کے یہاں فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا کہ صرف پہلی چیز کو مدار دین قرار دو۔ دوسرے امور میں توسع کا طریقہ اختیار کرو۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یا ایہا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم۔ وان ھٰذہ امتکم واحدۃ وانا ربکم فاتقون	اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور یہ تمھارے دین کے لوگ سب ایک دین پر ہیں۔ اور میں تمھارا رب ہوں۔ سو مجھ سے ڈرو۔

(مومنون ۵۳)

اس آیت کے مطابق وہ واحد دین جو تمام پیغمبروں کے درمیان متفق علیہ ہے، یہ تھا ——— خوراک میں حلال و حرام کا لحاظ رکھنا، نیک عمل کرنا، اللہ کو علیم و خبیر جانتے ہوئے زندگی گزارنا، اللہ کو اپنا رب اور آقا بنانا، صرف اللہ سے ڈرنا۔ بعض دوسری آیتوں میں چند اور چیزوں کا اضافہ ہے۔ مثلاً حنیفیت، انابت الی اللہ، نماز، روزہ، شرک سے پرہیز (روم ۔ ۳۱) اوپر کی آیت میں "عمل صالح" ان سب چیزوں کے لئے جامع لفظ ہے۔ عمل صالح میں مذکورہ متعین اعمال کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو قرآن کی دوسری آیات سے بالفاظ صریح ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً روزہ، عدل، ترک ظلم وغیرہ۔

یہی ثابت شدہ اور متفق علیہ دین "دین قیم" ہے۔ اور دین میں اصل اہمیت انھیں چیزوں کی ہے۔ انھیں کو مدارِ دعوت بنانا ہے اور انھیں کی بنیاد پر امر و نہی کی مہم چلانا ہے (آل عمران ۱۰۴) ان کے سوا جو چیزیں شریعت اور منہاج سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں اپنے حالات کے لحاظ سے اگرچہ لازماً کوئی نہ کوئی ضابطہ اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کی حیثیت ہمیشہ اضافی ہوگی۔ اگر ان کے معاملہ میں وہ شدت اختیار کی جائے جو حقیقی امور کی ہے تو یہ سبل متفرقہ کا اتباع (انعام ۱۵۳) ہے جو صرف اختلاف امت پر منتج ہوتا ہے۔ کیوں کہ الدین ایک ہے۔ جب کہ شریعت اور منہاج میں فرق ہے اور لازماً فرق رہے گا۔ اس فرق کی وجہ سے ان کے معاملہ میں کلی اتحاد ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر آپ ایک ایسا کام کر رہے ہیں جس کی نوعیت شریعت اور منہاج کی ہے تو اس کو یہ عنوان مت

---

۵ (شرعۃ ومنھاجا) عن ابن عباس سبیلاً وسنۃً وکذا روی عن مجاھد وعکرمۃ وحسن البصری وقتادہ والضحاک والسدی، ابن کثیر

دیکھئے کہ ——— "یہی تمام انبیاء کا مشن تھا"۔ شریعت اور منہاج میں مختلف طریقوں کا امکان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کسی کے لئے ایک طریقہ قابل ترجیح ہوگا کسی کے لئے دوسرا۔ اب اگر اسی کو انبیاء کا اصل مشن بتایا جائے تو مختلف لوگ مختلف چیزوں کو انبیاء کا مشن سمجھنے لگیں گے اور نتیجۃً ایک دین بہا کئی دین بن جائیں گے۔ اور وہ تفرق فی الدین وجود میں آئے گی جو اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے شرعۃ اور منہاج کی ایک ایک مثال لیجئے۔

سیکڑوں برس سے مسلمانوں میں بار بار ایسے لوگ اٹھتے رہے ہیں جن کا کہنا تھا کہ لوگو "نماز ادا کرو"۔ مگر ان کوششوں نے امت کے اندر کبھی کوئی نمازی فرقہ پیدا نہیں کیا۔ آج کوئی ایسا تنظیمی ڈھانچہ نہیں ہے جو اس لئے علیحدہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ لوگوں کو نماز کی تاکید کرتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ اٹھے جنھوں نے اس قسم کے مسائل چھیڑے کہ نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں۔ آمین دھیرے سے کہنا افضل ہے یا زور سے کہنا، رفع یدین کے ساتھ نماز درست ہے یا اس کے بغیر۔ اس قسم کی بحثوں نے ملت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔ الگ الگ مدرسے، الگ الگ مسجدیں، الگ الگ جماعتی حلقے وجود میں آگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسئلہ شرعۃ کی نوعیت کا تھا، اس کو انھوں نے الدین کی حیثیت دے دی۔ دین کا وہ حصہ جس میں ایک سے زیادہ طریقوں کی گنجائش تھی، اس کو دین کے اُس حصہ کی مانند بنانا چاہا جس میں کوئی ایک ہی طریقہ درست ہوتا ہے۔

اب منہاج کی ایک مثال لیجئے۔

مسلمان قرن اول سے لے کر اب تک ہر دور میں حکمرانوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان سیاسی مقابلوں کی وجہ سے امت میں کوئی علیحدہ فرقہ بن گیا ہو جو اس حیثیت سے جانا جاتا ہو کہ یہ "مسلم سیاسی فرقہ" ہے۔ ساری تاریخ میں صرف دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ایک شیعہ۔ دوسرے وہ لوگ جو موجودہ زمانہ میں اپنے کو حکومت الٰہیہ کا علم بردار کہتے ہیں۔ شیعہ گروہ پہلی صدی ہجری میں اسلامی سیاست کا جھنڈا لے کر اٹھا۔ مگر اس کی سیاست، دوسرے سیاسی لوگوں سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ دوسرے لوگوں نے سیاست کو صرف سیاست (بالفاظ دیگر عملی ضرورت) کے طور پر اختیار کیا تھا۔ جب کہ شیعہ حضرات نے سیاست کو مستقل عقیدہ قرار دیا۔ سیاست اپنی نوعیت کے اعتبار سے، منہاج کے ذیل کی چیز تھی جس کی صورت وقتی حالات کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ مگر شیعہ گروہ نے سیاست کو الدین کی طرح دائمی حکم ثابت کرنا چاہا ——— خاص طرح کے مزاج کے سوا عام لوگ ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت کے اندر ایک نیا فرقہ وجود میں آگیا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ حکومت الٰہیہ کے علم بردار ہیں، وہ ایک اور انداز سے اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان کی دائمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کا سیاسی نظام قائم کرنے کے لئے "اپنی جان لڑائے"، کیونکہ یہی اصل دینی مشن ہے اور اسی کے لئے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے تھے۔ اسلامی حکومت بجائے خود یقیناً ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر وہ منہاج کے ذیل کی چیز ہے نہ کہ الدین کے ذیل کی۔ وہ دین کا اضافی جزء ہے نہ کہ حقیقی جزء۔ یہ کوئی علی الاطلاق مشن نہیں ہے بلکہ وقتی حالات یہ طے کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اہل ایمان کی کیا ذمہ داری ہے۔ چنانچہ سارے قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں بالفاظ صریح اس طرح کا حکم دیا گیا ہو یا اس کو انبیاء کا مشن بتایا گیا ہو۔ ایسی حالت میں خاص طرح

کی ذہنی افتاد کے لوگ ہی اس اپچ کا ساتھ دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس عقیدہ کے گرد جمع ہوئے وہ عام امت سے الگ ایک قسم کا سیاسی فرقہ بن کر رہ گئے۔

اوپر کی آیات میں جن چیزوں کو "الدین" قرار دیا گیا ہے، اگر ان کی اقامت و پیروی کے لئے جدوجہد کی جائے تو امت میں کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آئے گا۔ کیوں کہ یہ تمام کی تمام متفق علیہ چیزیں ہیں۔ ان کی تحریک سے اتحاد کی فضا ابھرے گی۔ اس کے برعکس شرعۃ اور منہاج کی نوعیت کی چیزوں کو لے کر اٹھنا اور کہنا کہ یہی الدین ہے، صرف تفریق فی الدین کا سبب بنے گا۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسی قسم کی چیزوں کو دعوت و تحریک کی بنیاد بنا کر اپنا وہ حال کر لیا ہے جس کی تصویر اس آیت میں دی گئی ہے:

الَّذِینَ فَرَّقُوا دِینَھُمْ وَکَانُوا شِیَعًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُونَ (روم - ۳۲)

جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور ہو گئے فرقے فرقے۔

یہ فرقہ بندی کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ دین کی اصل روح کو ختم کر دینے والی ہے۔ دینی اتحاد کی فضا ہو تو آدمی خدا سے جُڑتا ہے۔ لوگوں کی توجہ دین کے حقیقی تقاضوں پر لگی رہتی ہے۔ اس کے برعکس دینی اختلاف کی فضا ہو تو اصل دینی تقاضے دب جاتے ہیں۔ لوگ اہم کو چھوڑ کر غیر اہم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اپنے حلقے سے وابستگی کا نام لوگوں کے نزدیک دین بن جاتا ہے۔ ان کو اس اعلیٰ ایمانی سطح کا تجربہ ہی نہیں ہوتا جب کہ آدمی ہر چیز سے اوپر اٹھ کر "خدا کے حضور میں چلنے لگتا ہے"۔

ورنہ ہم سنت الٰہی کی زد میں آجائیں گے

سابق اہل کتاب (بنی اسرائیل) کو خدا کی طرف سے جو مشن سپرد ہوا، وہ تبیین کتاب (آل عمران ۱۸۷) تھا یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا۔ بعد کے دور میں جب ان پر زوال آیا تو وہ اس کام کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل پڑے۔ تاہم اپنے نعروں اور تقریروں میں اب بھی وہ تورات ہی کی زبان استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اقامتِ تورات کے لئے کر رہے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ کے یہودیوں کی صہیونی تحریک تمام تر ایک قومی تحریک ہے۔ مگر اس کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں تورات کے حوالے دیتے ہیں۔ ایک ایسا کام جس کا خدائی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں، اس کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا یہ سب کچھ خدائی احکام کی تعمیل میں کیا جا رہا ہے۔

یہود کے اس طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنھم بمفازۃ من العذاب ولھم عذاب الیم (آل عمران - ۱۸۸)

وہ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا، اس پر ان کی تعریف ہو۔ ان کو عذاب سے بچاؤ میں نہ سمجھو۔ اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

یہی معاملہ ہر اس قوم کا ہوتا ہے جس کو خدا کی کتاب کا حامل بنایا گیا ہو۔ بعد کے دور میں جب اس قوم پر زوال

آتا ہے اور وہ کتاب اللہ کو ایک چھوڑی ہوئی کتاب (فرقان ۳۰) بنادیتی ہے تو یہ چھوڑنا صرف عملاً ہوتا ہے نہ کہ لفظاً۔ اس کی زندگی اور اس کی سیاست حقیقۃً دوسری راہوں پر چل رہی ہوتی ہے مگر اس کے رہنما اپنی غیر خدا پرستانہ تحریکوں کو ہمیشہ خدا پرستانہ اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک غیر دینی کام پر دین کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں۔" وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے کام کے لئے ان کی تعریف کی جائے جس کو انھوں نے کیا نہیں"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لمبی مدت گزرنے کی وجہ سے دینی الفاظ اور تصورات اس قوم کی روایات میں شامل ہو جاتے ہیں۔ قومی قیادت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قوم کی مانوس دینی اصطلاحات میں کلام کرے۔ اس کے بغیر نہ رہنماؤں کا اعتماد قوم کے اندر قائم ہو سکتا اور نہ عوام کا پر جوش تعاون ان کو مل سکتا ——— یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت کا ہوا ہے۔ انھوں نے قومی جذبات کے تحت تحریکیں اٹھائیں اور ان کو اسلام کا تقاضا بلکہ انبیاء کا اصل مشن بتاتے رہے۔ انھوں نے ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا چاہا جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا تھا۔

مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریکیں چلائیں اور ان کو "جہاد" کا عنوان دیا۔ حالاں کہ جہاد خدا کے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے جدوجہد کا نام ہے نہ کہ کسی ایسی سیاست کا جس کا مقصد یہ ہو کہ اجنبی حکمرانوں کو ہٹا کر ملکی لوگوں کو اقتدار کے تخت پر بٹھایا جائے۔ انھوں نے سیکولر مقاصد کے تحت متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے "صحیفہ مدینہ" کا حوالہ دیا۔ حالاں کہ یہ صحیفہ مدینہ کے اوپر اسلام کے غلبہ کا اعلان تھا نہ کہ کسی مشترکہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی شمولیت کا۔ یہ صحیفہ کوئی دوطرفہ معاہدہ نہ تھا۔ وہ "خدا کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے ایک نوشتہ تھا مہاجرین قریش اور اہل یثرب کے لئے"۔ اس میں درج تھا: وانکم مهما اختلفتم فيه من شئ فان مردّه الى الله والى رسوله (اہل مدینہ کے درمیان جب کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو تو اس کے فیصلہ کے لئے خدا اور اس کے رسول سے رجوع کیا جائے گا) کسی اکثریت کا سیکولر ضمیمہ بننے کی کوشش سے اس صحیفہ کا کیا تعلق۔ انھوں نے معاشی اور سماجی حقوق کے حصول کے لئے احتجاج و مطالبات کی تحریک چلائی اور اپنے منشور میں یہ لکھا کہ ہم خیر امت کا کردار ادا کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ حالاں کہ جن اقوام کے خلاف وہ حقوق طلبی کی مہم لے کر اٹھے تھے، وہ ان کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی تھیں اور مدعو قوم سے "اجر" کا مطالبہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ انھوں نے انسانی بھائی چارہ اور دنیوی امن کے لئے تقریری مہم چلائی اور کہا کہ یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تھا کیونکہ دور جاہلیت کے حلف الفضول[1] میں آپ شریک ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مظلوموں کی مدد اور حق داروں کو ان کا حق دلانے کے اس معاہدہ میں آپ نے اپنی پندرہ سال کی عمر میں شرکت فرمائی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد آپ نے فرمایا: لو دعيتُ به في الاسلام لاجبت (زمانہ اسلام میں بھی اگر مجھے اس کے لئے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا) مگر

---

[1] اس معاہدہ کا نام حلف الفضول اس لئے پڑا کہ اس میں یہ جملہ تھا: تُردُّ الفضول الیٰ اهلها (سہیلی، روض الانف) یعنی مال ان کے مالکوں کو لوٹایا جائے گا۔

اولاً تو حِلف الفضول تقریری دوروں کی کوئی مہم نہ تھی۔ وہ عملی دادرسی کا عہد نامہ تھا۔ دوسرے نبوت ملنے کے بعد آپ نے خود حِلف الفضول کی تجدید نہیں کی بلکہ اس میں شرکت کو دوسروں کی پکار پر مشروط رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حلف الفضول بجائے خود ایک جائز اور مطلوب کام ہونے کے باوجود بہر حال فلاح دنیا کے ذیل کا ایک پروگرام تھا۔ جب کہ نبوت کا اصل مشن فلاح آخرت کا پیغام ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ قائدین نے اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چھیڑ دی اور اعلان کیا کہ شریعت اسلامی کے نفاذ اور قیادت صالحہ کے قیام کے لئے ہم ایسا کر رہے ہیں۔ حالاں کہ صریح ہدایات کے مطابق اسلام میں یہ جائز ہی نہیں کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کی جائے۔

اس قسم کی تمام "اسلامی" مہمیں جن میں مسلمان موجودہ زمانہ میں مشغول رہے ہیں وہ سب کی سب یُحِبُّونَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا کا مصداق ہیں۔ یہ ایک غیر اسلامی کام کے لئے اسلام کا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش ہمیشہ خدا کی نصرت سے محروم رہتی ہے، اس لئے خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کی جائے، وہ بہر حال بے نتیجہ رہے گی۔ وہ امت کے لئے کسی حقیقی کامیابی کا باعث نہیں بن سکتی۔ بائبل کی روایات کے مطابق دارا بادشاہ (پانچویں صدی قبل مسیح) کے زمانہ میں ایک حَجَّی نبی گزرے ہیں۔ انھوں نے یہود کی بگڑی ہوئی حالت پر ان کو تنبیہ کی۔ انھوں نے تمثیلی زبان میں کہا:

> "رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔ کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہ آسمان سے اوس گرتی ہے اور نہ زمین اپنا حاصل دیتی ہے۔ (باب اول)

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا انجام ہوا ہے۔ انھوں نے "بہت بویا پر تھوڑا کاٹا"۔ عالی شان تحریکوں اور دھواں دھار کانفرنسوں کا حاصل عملاً اتنا کم ہوتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارا ہر قائد اپنی "محنت کی کمائی" کو سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ - ۱۷۶۲) نے احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ مرہٹوں پر حملہ کرایا۔ سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ - ۱۸۳۱) نے سکھوں سے جہاد کیا۔ مگر عملاً اس کا فائدہ صرف انگریز کو پہنچا۔ سید قطب مصری (۱۹۰۶ - ۱۹۶۶) اور ان کے ساتھیوں نے شاہ فاروق کے خلاف قربانیاں دیں۔ مگر اس کا فائدہ تمام تر فوجی افسروں کے حصہ میں چلا گیا۔ پاکستان میں اسلام پسندوں نے جمہوریت کے ذریعہ اسلام کا اقتدار لانے کے لئے ۳۰ سال تک سرفروشی کی۔ مگر اس کا فائدہ مسٹر بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسے لوگوں کو ملا۔ ۱۹۴۳ میں جامعہ ازہر سے ایک جلوس نکلا جس کی قیادت شیخ حسن البنا (۱۹۰۶ - ۱۹۴۸) کر رہے تھے۔ ہزاروں پُر جوش مسلمانوں نے قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) کے نعروں کے ساتھ اسرائیل کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پچھلے ۵۰ سال میں اس مہم میں جان و مال کی اتنی زیادہ

قربانیاں دی گئی ہیں جو تین سو سالہ صلیبی جنگوں کی مجموعی قربانی سے بھی زیادہ ہیں ۔ مگر فلسطین کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ جہاں وہ ۱۹۴۸ میں تھا، آج اس سے کہیں زیادہ دور جا چکا ہے ۔

اس مدت میں ہمارے درمیان ایسے قائدین اٹھے جن کو بادشاہوں تک کا تعاون حاصل تھا (شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی) ہم نے ایسی تحریکیں اٹھائیں جنھوں نے عظیم ترین آبادی والے ملک کے تقریباً تمام مسلمانوں کی تائید حاصل کر لی (مسلم لیگ) حتی کہ ہمارے درمیان ایسی بھی تحریکیں اٹھیں جن کو تمام عالم اسلام کی مشترکہ حمایت حاصل تھی (فلسطینی تحریک) اس کے باوجود صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی ۔ آج بھی یہ حال ہے کہ کسی جماعت کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اس کے دینی اجتماعات میں دس دس لاکھ مسلمان شریک ہوتے ہیں (ہندستان) کسی اسلامی تحریک کے قائدین اپنی مقبولیت کو بتانے کے لئے یہ پُر فخر الفاظ بول رہے ہیں کہ ملک کا ہر فرد ان کے اسلامی نظام کے پروگرام سے اتفاق کرتا ہے (پاکستان) یہ سب کچھ ہے مگر وہی چیز حاصل نہیں ہوتی جو تمام قائدین اور جماعتوں کا مشترک مقصد ہے یعنی اسلام کا غلبہ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے نمائندہ کی ہے ۔ وہ آسمانی کتاب کے حامل ہیں۔ ایسے کسی گروہ کی قسمت تمام تر اس کتاب کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہے ۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کی کتاب کا اعلان و اظہار کر رہے ہوں۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد وہ خدا کی نظر میں اسی طرح بے قیمت ہو جائیں گے جس طرح پچھلے حاملین کتاب بے قیمت ہو گئے ۔ کوئی دوسرا کام خواہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، خدا کی نظر میں ہم کو قیمت والا نہیں بنا سکتا ۔

۱۹۶۲ میں چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کیا۔ چینی فوجیں آسام کے علاقہ میں گھس آئیں ۔ اس وقت تیز پور (آسام) میں جو ہندستانی کمشنر تھا وہ اپنا دفتر چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنے وطن میں آکر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہو گیا۔ حکومت کو معلوم ہوا تو اس نے کمشنر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا ۔ اس پر سرکاری ڈیوٹی چھوڑنے کا مقدمہ چلایا گیا اور اس کو سخت سزا دی گئی ۔ بچوں میں رہنا یا اپنے گھر کا انتظام سنبھالنا عام آدمیوں کے لئے کوئی غلط بات نہیں ۔ مگر کمشنر کے لئے یہی بات ناقابل معافی جرم بن گئی ۔ کیوں کہ کمشنر کی قیمت "تیز پور" میں تھی ۔ گھر کے اندر نہ تھی ۔ اگر وہ اپنے ڈیوٹی کے مقام پر جما رہتا تو اس وقت وہ حکومت کا نشان ہوتا۔ بلکہ وہ حکومت کے لئے عزت کا سوال بن جاتا ۔ حکومت اس کو بچانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دیتی ۔ مگر جب اس نے اپنی وہ جگہ چھوڑ دی جہاں اس کو رکھا گیا تھا تو حکومت کی نظر میں اس نے اپنی قیمت کھو دی ۔ اب وہ ہر حال میں مجرم تھا۔ خواہ کسی اور میدان میں وہ کتنی ہی سرگرمیاں دکھا رہا ہو، خواہ وہ بظاہر صحیح اور مفید ہی کام کیوں نہ کر رہا ہو۔

ہماری نجات اور کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی کتاب کی طرف لوٹیں ۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ہم بھی اسی طرح سنت الٰہی کی زد میں آجائیں جس طرح اس سے پہلے یہود آگئے ۔ اور اس کے بعد نہ دنیا میں ہماری کوئی قیمت ہو اور نہ آخرت میں ۔ دوسرے دوسرے کاموں کو دعوتِ قرآن اور احیاء سنت کا نام دینا صرف ہمارے وزر (بوجھ) میں اضافہ کرتا ہے ۔ وہ کسی بھی حال میں ہماری نجات کا سبب نہیں بن سکتا ۔

عصری اسلوب میں اعلیٰ ترین اسلامی کتابوں کا مکمل سٹ

دین کیا ہے	از	مولانا وحید الدین خاں	Rs. 1.50
الاسلام	؍؍	؍؍	12.00
تجدید دین	؍؍	؍؍	2.00
ظہور اسلام	؍؍	؍؍	12.00
حالات صحابہ	؍؍	؍؍	
زلزلۂ قیامت	؍؍	؍؍	3.00
تاریخ کا سبق	؍؍	؍؍	
تعمیر ملت	؍؍	؍؍	
مذہب اور جدید چیلنج	؍؍	؍؍	13.50
اسلامیات	؍؍	؍؍	
عقلیات اسلام	؍؍	؍؍	

ماہنامہ **الرسالہ** تعمیری اور اصلاحی مضامین کے مستقل مطالعہ کے لئے زرتعاون سالانہ 24.00

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

MAKTABA AL-RISALA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
Regd. R.N. No. 28822/76

August 1978

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimjan Street, DELHI-110006 (INDIA)

رمضان المبارک میں
روزہ داروں کے لیے
طاقت و توانائی کا ذریعہ

سنکارا

جب آپ روزے رکھ رہے ہوں تو آپ کو اپنی صحت کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے۔ سنکارا روزہ رکھنے والوں کے لیے توانائی اور طاقت کے حصول کا بہترین وسیلہ ہے۔

اِس میں وہ تمام ضروری وٹامن اور معدنی اجزا شامل ہیں جن کی آپ کے جسم کو ضرورت ہے اور انہی کے ساتھ وہ قدرتی اجزا بھی شامل ہیں جن کی مدد سے روزمرہ کی خوراک کی پوری غذائیت جسم میں پہنچ کر تندرستی اور قوت کو بڑھاتی ہے۔ اس طرح سنکارا سے آپ دوہرا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

سحری اور افطار کے وقت سنکارا کی ایک ایک خوراک لینے سے تھکاوٹ دُور ہو کر چستی پیدا ہوگی اور آپ رمضان المبارک کے فرائض آسانی سے ادا کرنے کے لیے چُست و مستعد ہو جائیں گے۔

سنکارا

وٹامنوں اور قدرتی اجزا سے بھرپور
ہر موسم میں گھر بھر کے لیے
مثالی ٹانک

ہمدرد

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا